قواعد املا و انشا

اختر حسین فیضی مصباحی

ناشر
مجلس برکات، جامعہ اشرفیہ مبارکپور اعظم گڑھ
(یو پی) پن ۲۷۶۴۰۴

فہرست مضامین قواعد املا و انشا



پیش لفظ

اچھی عبارت اور پاکیزہ تحریر اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی جب تک کہ اصول املا اور قواعد انشا کی رعایت نہ کی جائے۔ الفاظ کس طرح لکھے جائیں، کون سا حرف کس حرف سے کب ملا کر لکھا جائے اور کب جدا لکھا جائے، یوں ہی لفظ کی نشست اور کشش کس طور کی ہو، یہ سب ''املا'' کے مسائل ہیں۔ جملوں کو کس طرح تحریر کا جامہ پہنایا جائے اور کیسے پر کشش بنایا جائے اس کا تعلق ''انشا'' سے ہے۔

پیش نظر کتاب ''قواعد املا و انشا'' انھی دونوں کے مسائل کا احاطہ کرتی ہے جو استاذی الکریم علامہ محمد احمد مصباحی شیخ الجامعہ، جامعہ اشرفیہ مبارک پور کی نگرانی میں نو آموز طلبۂ مدارس کے لیے تیار کی گئی ہے تاکہ صحیح املا نویسی اور عمدہ انشا پردازی میں ان کی رہ نمائی کرے اور عام شائقین ادب و انشا کے لیے بھی معاون ثابت ہو۔

کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، حصۂ اول میں املا کے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے اور حصۂ دوم میں مضمون نویسی کے اصول و آداب بتائے گئے ہیں اور چند مشقی عنوانات ان کی ذیلی سرخیوں کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ ساتھ ہی کتاب کے آخر میں نمونے کے طور پر چند مضامین کا ایک خوب صورت انتخاب بھی پیش کیا گیا ہے تاکہ طلبہ ان کی روشنی میں مشق کر کے اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی پر قدرت حاصل کریں اور پختہ تحریر پیش کرنے کا اسلوب سیکھیں۔

اس کتاب کی ترتیب کے وقت درج ذیل کتابیں پیش نظر تھیں:

(۱) قواعد اردو : بابائے اردو مولوی عبد الحق انجمن ترقی اردو، نئی دہلی

(۲) قواعد اردو : پروفیسر فدا علی خاں خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

(۳) زبدۃ القواعد : ڈاکٹر زبید احمد ایم، اے منشی گلاب اینڈ سنز الہ آباد

(۴) اردو املا : رشید حسن خاں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

(۵) اردو کیسے لکھیں : رشید حسن خاں مکتبہ جامعہ لیمٹیڈ نئی دہلی

(۶) عبارت کیسے لکھیں: ؍؍ ؍؍ ؍؍ مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر نئی دہلی

(۷) املا نامہ : گوپی چند نارنگ ترقی اردو بیورو نئی دہلی

(۸) آیئے لکھنا سیکھیں : شکیل اختر فاروقی مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ نئی دہلی

(۹) اردو زبان وقواعد: شفیع احمد صدیقی مبارک پوری، مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ نئی دہلی

کتاب کی تکمیل کے بعد حضرت شیخ الجامعہ مدظلہ نے فرمایا کہ اس کا مسودہ قواعد املا سے شغف رکھنے والے چند حضرات کو دے دیا جائے پھر بحث ومشاورت کے بعد جو طے ہوا سے آخری شکل دی جائے۔اس تجویز پر عمل ہوا اور اس کے فوائد بھی سامنے ،آئے۔ امید ہے کہ یہ کوشش طلبۂ مدارس اور شائقین ادب کے لیے ضرور لائق استفادہ ہوگی۔

اختر حسین فیضی مصباحی
ساکن: جہانا گنج، اعظم گڑھ
استاد: جامعہ اشرفیہ مبارک پور

۷/۳/۱۴۳۲ھ
۱۱/۲/۲۰۱۱ء
جمعہ

تقدیم

از : صدر العلما علامہ محمد احمد مصباحی، شیخ الجامعہ، جامعہ اشرفیہ مبارک پور

باسمہٖ وحمدہ تعالیٰ وتقدّس

خیال ہوتا ہے کہ قواعد املا کی ضرورت کیا ہے؟ جو اردو لکھنا پڑھنا جان گیا اس کا املا درست ہی ہوگا، الفاظ اور جملے کتابوں میں جس طرح لکھے ہوتے ہیں اُسی طرح لکھنا ہے۔ عمومی حد تک یہ خیال درست ہے مگر قواعد کی ضرورت اُن الفاظ میں پیش آتی ہے جن کا املا قلمی تحریروں اور مطبوعہ کتابوں میں مختلف شکلوں میں نظر آتا ہے، ایسے وقت عام قاری الجھن کا شکار ہوتا ہے کہ صحیح کیا ہے؟ اسے چند مثالوں کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ یہاں ایک طرف غلط املا خط کشیدہ الفاظ کے ذریعہ نمایاں کیا گیا ہے، دوسری طرف صحیح املا دِکھایا گیا ہے، کچھ تفصیلی گفتگو کتاب کے اندر دیکھ سکتے ہیں۔

غلط املا	صحیح املا
۱-دوکاندار اپنے قرض کا تقاضہ کرنے کیلئے نکلا اور خریدار کے گھر پہونچا۔	۱- دُکان دار ... تقاضا ... کے لیے ... پہنچا۔
۲-ہمنے دیر تک یہ تماشہ دیکھا	۲-ہم نے ... تماشا ...
۳- تمہارا دوست صبح یہاں آیا۔ مگر ہمسے ملنا گوارہ نہ کیا	۳-تمھارا ... صبح یہاں ... ہم سے ... گوارا ...
۴-ابتداء، انتہاء، استدعاء، علماء، فضلاء، حکماء، نداء، دعاء، جزاء۔	۴- ابتدا ، انتہا ، استدعا ، علما ... (اردو میں سب بلا ہمزۂ آخر ہوں گے)
۵-اسنے اس نکتہ پر توجہ دی	۵-اس نے اس نکتے پر ...
۶- حکماء دہر اور علماء زمانہ اس فلسفہ کے حل سے قاصر ہیں۔	۶-حکماے دہر اور علماے زمانہ اس فلسفے کے ...
۷-اعلا، ادنا سبکا مدّعیٰ یہ تھا کہ اس جھگڑا کو کسطرح ختم کرنا چاہئے	۷- اعلیٰ ، ادنیٰ سب کا مدّعا ... اس جھگڑے کو کسی طرح ... چاہیے۔
۸- تقاضۂ زمانہ اور مقتضیٰ حال پر نظر رکھنا ضروری ہے۔	۸-تقاضاے زمانہ اور مقتضاے حال ...

یہ چند نمونے پیش کر دیے گئے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ اس طرح کی غلطیاں قلمی اور مطبوعہ تحریروں میں نظر آتی رہتی ہیں جن کے باعث کچھ ایسے اصول وضوابط کی ضرورت پیش آتی ہے جن کی روشنی میں ہم اپنی تحریریں غلطیوں سے محفوظ رکھ سکیں۔

اردو زبان قدیم ہندی اور عربی و فارسی الفاظ سے مرکب ہے۔ اب اس میں انگریزی الفاظ بھی کثرت سے داخل ہو چکے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے پیش نظر اردو املا محض ہندی بنیادوں پر قائم نہیں ہو سکتا، خصوصًا فارسی عربی الفاظ جو اردو کی شان و شوکت کا ذریعہ اور اس کا تہذیبی ورثہ ہیں، ان کی صورت کو مسخ نہیں کیا جا سکتا۔ بعض حضرات نے یہ مشورہ دیا تھا کہ ص، ض، ط، ظ، ذ، ث وغیرہ کی شکلیں ختم کر دی جائیں اور ان کی جگہ س، ت، ز سے کام لیا جائے مگر اردو دنیا اسے قبول نہ کر سکی اور اسے مقبول ہونا بھی نہیں چاہیے، اسی طرح یہ تجویز بھی سامنے آئی کہ اعلیٰ، ادنیٰ، مرتضیٰ، موسیٰ، عیسیٰ وغیرہ کو پورے الف سے اعلا، ادنا، مرتضا، موسا، عیسا لکھا جائے۔ بعض حلقوں میں اس پر عمل بھی شروع ہو گیا، مگر اسے قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔ املا کی اس تبدیلی سے ایک تو ان الفاظ کی اصلیت دفن ہو جاتی ہے۔ دوسرے، صدیوں سے جو املا عوام و خواص سب میں رائج و مقبول رہا ہے اسے ترک کرا کے ایک نئی راہ کا پابند بنانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جب کہ روایت اور رواج عام کا، املا اور تلفظ دونوں میں اہم کردار ہوتا ہے اس سے صَرفِ نظر روا نہیں[1]۔

---

[1] تلفظ سے متعلق چند مثالیں یہ ہیں: ① جمہور، دستور، صندوق یہ سب عربی میں بضمِ اول ہیں مگر فارسی اردو میں بفتحِ اول مستعمل ہیں اس طرح سوال عربی میں بضمِ اول ہے اور دوسرا حرف ہمزہ ہے مگر فارسی اردو میں بفتحِ اول اور واو سے مستعمل ہے۔ خزانہ عربی میں بکسر اول ہے اور فارسی اردو میں بفتحِ اول۔ ② حیوان، سیلان، دوران، جولان، حرکت، عظمت، برکت وغیرہ عربی میں بفتحِ اول و دوم ہیں مگر فارسی اردو میں بسکون دوم مستعمل ہیں۔ ③ نفی، رمی، وحی، عربی میں بفتحِ اول و سکونِ دوم ہیں مگر اردو نثر میں بفتحِ اول و کسر دوم بلا نکیر مستعمل ہیں۔ ہاں جب یہ کسی فارسی ترکیب میں مضاف یا معطوف علیہ ہو کر آتے ہیں تو اصلی حالت (فتح اول و سکون دوم) پر رہتے ہیں۔ جیسے وحیِ خدا، نفیِ ماسوا، رمیِ جمرہ۔ وحی والہام، نفی واثبات۔

اردو املا سے متعلق مولانا احسن مارہروی (م ۱۹۴۰ء) نے رسالہ فصیح الملک مئی ۱۹۰۵ء میں کچھ تجاویز پیش کی تھیں، پھر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اس موضوع پر برابر لکھتے رہے۔ آزادی سے قبل مولوی عبدالحق بابائے اردو کی تحریک پر انجمن ترقی اردو نے املا کمیٹی بنائی اس کے متعدد جلسے ہوئے اور تجاویز شائع ہوئیں۔ آزادی کے بعد ترقی اردو بورڈ اس سلسلے میں سرگرم عمل ہوا، دوسری اجتماعی و انفرادی کوششیں بھی ہوتی رہیں۔ رشید حسن خاں نے اس موضوع کو خاص طور سے اپنا ہدف بنایا اور اردو املا کے نام سے ایک مبسوط اور مفصل کتاب لکھی اور کئی مختصر کتابیں بھی لکھیں۔ پاکستان میں بھی اس طرف توجہ دی گئی۔

نئی دہلی کے ترقی اردو بورڈ کی سفارشات ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مرتب کیں جو پہلی بار ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئیں۔ اس کی بعض تجاویز سے اختلاف کرتے ہوئے بہت سی رائیں سامنے آئیں، جن کے باعث پہلی سفارشات پر نظر ثانی کے لیے ترقی اردو بورڈ کے تحت متعدد اجلاس ہوئے اور ترمیم شدہ سفارشات املا نامہ طبع دوم ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئیں۔ یہ زیادہ معتدل اور جامع اصولوں پر مبنی ہیں۔

مجلس برکات کے تحت قواعد املا کی ترتیب میں ان کاوشوں کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اصول ہم نے بھی اپنایا ہے کہ جہاں تک ہو سکے عربی فارسی الفاظ کو ان کی اصلی حالت پر رکھا جائے مگر جہاں فارسی یا اردو کا تصرف پوری طرح اثر انداز ہو چکا ہے وہاں بعد تصرف جو رواج عام ہے اس کی پیروی کی جائے۔ اسی طرح یہ قاعدہ بھی اپنایا گیا ہے کہ جن الفاظ کا کوئی خاص املا عوام و خواص سب میں رواج پا چکا ہے اُسے ترک کرانے پر زور نہ دیا جائے۔ ہاں کوئی چیز بالکل بے اصل یا خلاف اصول کچھ لوگوں کے املا میں در آئی ہے تو اس سے باز رکھنے کی کوشش ضرور ہونی چاہیے۔ بعض مقامات پر اپنی پسندیدہ اور ترجیحی صورت بتا دی گئی ہے اور دوسری صورت کا بھی جواز رکھا گیا ہے۔ املا نامہ وغیرہ کی دو چار تجویزوں سے اختلاف بھی کیا گیا ہے، اس کی وجہ

کتاب میں بیان کر دی گئی ہے۔

یہ کتاب مدارس کے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے مگر امید ہے کہ دوسرے اردو داں حلقے بھی اس سے پوری طرح مستفید ہوں گے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ انشا سے متعلق ہے۔ انشا دراصل مشق اور ذوق کی چیز ہے مگر استاد کی رہنمائی اس میں اہم رول ادا کر سکتی ہے۔ ابتدائی بچوں سے ان کے گرد و پیش کی چیزوں پر چند جملے کہلوائے جائیں، پھر لکھوائے جائیں، جب وہ کسی ایک عنوان پر دس بارہ مربوط جملے لکھنے کے عادی ہو جائیں تو انھیں مضمون کو مزید بڑھانے پھیلانے کی راہ دِکھائی جائے۔ ثانوی اور عالیہ درجات کے طلبہ نے اگر اب تک مضمون نویسی کی مشق بالکل نہیں کی ہے تو انھیں بھی اسی انداز پر چلانا ہوگا۔ مگر ان کا کام نسبۃً آسان ہوگا۔ البتہ درجے کے معیار پر لانے کے لیے ذرا زیادہ محنت کی ضرورت ہوگی، ذوق سلیم کی مساعدت، مشق کی کثرت اور استاد کی رہنمائی کے ساتھ وہ بھی بہت جلد معیار پر پورے اتر سکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ نہ احساسِ کمتری کا شکار ہوں، نہ محنت سے جی چرائیں۔ اچھے اہل قلم کی نگارشات بھی کثرت سے پڑھیں اور پڑھنے کے ساتھ ان سے کچھ اخذ بھی کریں۔ مضمون نگار نے کہاں کہاں سے مواد جمع کیا؟ کس معیار کے مراجع سے اخذ کیا؟ کس طرح ترتیب دی؟ اپنے مقاصد و مطالب کو ذہن نشیں کرنے اور دل چسپ بنانے کے لیے زبان و بیان میں کیا کیا خوبیاں پیدا کیں؟ یہ ساری چیزیں بہت غور سے دیکھنے، سمجھنے اور اخذ کرنے کی ہوتی ہیں۔ محض عامیانہ نظر اور سرسری مطالعے سے معیاری انشا اور حسنِ نقد و تحقیق کا حصول نہیں ہوتا۔ واللہ خیر موفق و معین۔

محمد احمد مصباحی

یکم رمضان المبارک ۱۴۳۲ھ

۲/اگست ۲۰۱۱ء

حصۂ اول: قواعد املا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زبانوں کی بنیاد اہل زبان کے استعمال پر ہوتی ہے۔قواعد بعد میں وضع ہوتے ہیں۔عربی، فارسی، انگریزی وغیرہ زبانوں کا رواج پہلے ہوا بعد میں اہل زبان کے انداز استعمال اور طرز ادا کو دیکھتے ہوئے قواعد کی ایجاد ہوئی۔

اردو زبان بھی پہلے وجود میں آئی اور بہت بعد میں اس کے قواعد لکھے گئے خاص اردو سے متعلق جو قواعد تحریر ہوئے ہیں وہ تین قسم کے ہیں۔

۱:- قواعد املا ۲:- قواعد صرف ۳:- قواعد نحو۔

۱:- قواعد املا میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اردو میں استعمال ہونے والے حروف اور الفاظ کس طرح لکھے جائیں۔

۲:- قواعد صرف میں اسم، فعل، حرف کی انفرادی حالت اوزان میں ہونے والی تبدیلیوں کی کیفیت بتائی جاتی ہے۔

۳:- قواعد نحو میں جملوں کے بنانے اور ایک دوسرے سے ملانے کی کیفیت کا بیان ہوتا ہے۔

یہاں صرف املا کے تعلق سے بحث ہوگی۔اس لیے درج ذیل تفصیلات ذہن نشین کرلینا ضروری ہے۔

حروف: سادہ آواز کی ان تحریری علامتوں کا نام ہے جن کے ملنے سے لفظ بنتے ہیں۔جن حروف سے کسی زبان کے الفاظ مرکب ہوتے ہیں انھیں اس زبان کے حروف تہجی یا حروف ہجا کہتے ہیں۔

اردو زبان چوں کہ ہندی، سنسکرت، فارسی اور عربی سے مل کر بنی ہے اس لیے اس میں ان سب زبانوں کے حروف موجود ہیں، یہ کل اکیاون حروف ہیں:

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ء ی ے۔یہ سینتیس (۳۷)

حروف ہیں جو مفرد کہے جاتے ہیں۔ان کے علاوہ چودہ حروف وہ ہیں جو دو حرفوں سے مل کر ایک حرف کی آواز ظاہر کرتے ہیں۔وہ یہ ہیں۔ بھ پھ تھ ٹھ جھ چھ دھ ڈھ ڑھ کھ گھ لھ مھ نھ ۔یہ مرکب حروف کہے جاتے ہیں۔اس طرح کل اکیاون حروف ہوئے۔

ہر مرکب حرف کا دوسرا جز (ہ) ہے جس کی آواز کے ساتھ اس کے پہلے حرف کی سادہ آواز مل کر نکلتی ہے اور (ہ) بغیر کسی دوسرے حرف کی آواز سے ملے مفرد بھی استعمال ہوتا ہے اس لیے امتیاز کے لیے مرکب کی صورت میں اسے دو چشمی (ھ) سے لکھتے ہیں، مثلاً ''کہا'' اور ''کھا'' یہ دونوں الگ الگ لفظ ہیں تلفظ کے اعتبار سے بھی اور معنی کے اعتبار سے بھی۔اس لیے ان کے املا میں فرق کرنا چاہیے۔

ان میں بعض حروف عربی، فارسی اور ہندی میں مشترک ہیں اور بعض کسی ایک زبان کے ساتھ خاص ہیں۔

(۱) عربی کے خاص حروف: ث ح ذ ص ض ط ظ ع ق ء۔ان حروف میں سے ''ذ'' بعض فارسی الفاظ میں اور ''ق'' ترکی الفاظ میں پائے جاتے ہیں جیسے گذشتن، آذر فارسی زبان میں اور چقماق، آقا ترکی الفاظ میں۔

(۲) فارسی کا خاص حرف: ''ژ'' ہے جو عربی اور ہندی میں نہیں آتا۔

(۳) ہندی کے خاص حروف: ٹ ڈ ڑ اور ان کے علاوہ چودہ مرکب حروف بھ پھ تھ وغیرہ۔

(۴) فارسی اور عربی کے مشترک حروف: ز ف خ غ۔یہ حروف فارسی اور عربی میں استعمال ہوتے ہیں، ہندی میں نہیں آتے۔

(۵) فارسی اور ہندی کے مشترک حروف: پ چ گ۔یہ حروف فارسی اور ہندی میں استعمال ہوتے ہیں، عربی میں نہیں آتے۔

مُعْجمہ و مُہْملہ

نقطوں کے اعتبار سے ان حروف کی دو قسمیں ہیں: معجمہ، مہملہ

(۱) **معجمہ:** جن حروف پر نقطے ہوتے ہیں انھیں حروف **معجمہ** یا **منقوطہ** کہتے ہیں۔
وہ یہ ہیں: ب، پ، ت، ث، ج، چ، خ، ذ، ز، ژ، ش، ض، ظ، غ،
ف، ق، ن، ی[۱]، یے۔

(۲) **مہملہ:** جن حروف پر نقطے نہیں ہوتے ان کو **مہملہ** یا **غیر منقوطہ** کہتے ہیں۔ یہ دو طرح کے ہیں:

(۱) **غیر منقوط سادہ:** ا، ح، د، ر، س، ص، ط، ع، ک، گ، ل، م، و، ہ، ء، ی، ے۔

(۲) **غیر منقوط مع علامت "ط":** ٹ، ڈ، ڑ۔

تنبیہ: یہ بات ضرور ذہن نشین رہے کہ معجمہ اور مہملہ کی اصطلاح اس جگہ بولی جائے گی کہ دو حروف ایک ہی شکل کے ہوں اور فرق صرف نقطے کا ہو۔ جیسے ح، خ ان دونوں حرفوں کی شکل ایک ہے فرق صرف نقطے کا ہے اس لیے پہلے کو "حائے مہملہ" اور دوسرے کو "خائے معجمہ" کہیں گے۔

مگر "ف" اور "ن" کو فائے معجمہ اور نون معجمہ نہیں کہیں گے، یوں ہی "ل" اور "م" کو لام مہملہ اور میم مہملہ نہیں کہا جائے گا۔

☆ نقطوں کی تعداد کے اعتبار سے حروف کی تین قسمیں ہیں: موحدہ، مثناۃ، مثلثہ۔

(۱) **موحدہ:** جن حروف پر ایک نقطہ ہو۔ وہ یہ ہیں:

ب، ج، خ، ذ، ز، ض، ظ، غ، ف، ن۔

(۲) **مُثنّاۃ:** جن حروف پر دو نقطے ہوں۔ جیسے ت، ق۔ ی، یے۔

(۳) **مُثلّثہ:** جن حروف پر تین نقطے ہوں۔ جیسے پ، چ، ث، ش، ژ۔

☆ نقطوں کے موقع کے لحاظ سے حروف کی دو قسمیں ہیں: فوقانی، تحتانی۔

---

[۱] ی، ے یہ دونوں حروف جب شروع کلمہ یا درمیان کلمہ میں آئیں تو منقوطہ ہیں۔ جیسے: یوسف، شیر۔ اور کلمہ کے آخر میں آئیں تو غیر منقوطہ ہیں۔ جیسے: پانی، دانے۔

(۱) **فوقانی:** جس کے اوپر ایک یا زائد نقطے ہوں۔ وہ یہ ہیں:

ت، ث، خ، ذ، ز، ژ، ش، ض، ظ، غ، ف، ق، ن۔

(۲) **تحتانی:** جس کے نیچے ایک یا زائد نقطے ہوں۔ وہ یہ ہیں:

ب، پ، ج، چ، ی، یے۔

تنبیہ: بعض حروف کے نقطے پیٹ میں ہوتے ہیں اس لیے ان کے فوقانی اور تحتانی ہونے کی پہچان اس طرح ہوگی کہ ان کے ابتدائی اور درمیانی استعمال میں اگر نقطے اوپر لکھے جائیں تو فوقانی ہیں اور نیچے لکھے جائیں تو تحتانی۔ جیسے جنت، اس مثال میں ''ج'' تحتانی ہے، اس لیے کہ نقطہ نیچے دیا گیا ہے اور ''ن'' فوقانی ہے، اس لیے کہ اس کا نقطہ اوپر دیا گیا ہے۔

اردو میں کچھ حروف ایسے بھی استعمال ہوتے ہیں جن کے اوپر چھوٹی سی ''ط'' بنا دی جاتی ہے تو ایسے حروف کو ''ثقیلہ'' کہا جاتا ہے، یہ تین ہیں: ٹ، ڈ، ڑ۔ ان کے علاوہ کو ''غیر ثقیلہ'' یا ''خفیفہ'' کہیں گے۔

ی، ے کا شمار منقوطہ میں ہے لیکن ان کو جب آخر میں لکھتے ہیں تو ان پر نقطے نہیں دیتے، جب شروع یا درمیان میں لکھتے ہیں تو نقطے دیتے ہیں۔ جیسے انگور کی بیل۔ لوہے کی کیل۔ یاد۔ شادی۔ وعدے۔

اعراب (حرکات وسکنات)

اعراب سے مراد زبر، زیر، پیش اور جزم ہیں، ان ہی کے سہارے حروف کی آواز نکلتی ہے۔ اعراب عربی اصطلاح ہے، اردو میں اس کے لیے حرکات وسکنات کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

جس لفظ پر زبر، زیر اور پیش کی حرکت ہوتی ہے اسے متحرک کہا جاتا ہے، اور جس پر جزم کی علامت ہوتی ہے اسے ساکن یا موقوف کہتے ہیں۔ اتنی گفتگو ایک مرتبہ پھر سمجھ لی جائے۔

ا۔ **حرکت** : زبر، زیر، پیش کو کہتے ہیں۔ (ـَ، ـِ، ـُ)

۲۔ **متحرک** : وہ حرف جس پر زبر، زیر، پیش میں سے کوئی حرکت ہو۔ جیسے: "وَجْدْ" میں "وَ"۔

۳۔ **جزم** : وہ نشان جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ حرف متحرک نہیں (ْ)

۴۔ **ساکن** : وہ حرف جس پر جزم ہو۔ جیسے مالیدہ میں الف، ی، ہ ساکن ہیں اسی طرح سورج، مُورت، صورت میں واو اور ان الفاظ کے آخری حروف ساکن ہیں۔ بلفظ دیگر: جس پر کوئی حرکت (زبر، زیر، پیش) نہ ہو

۵۔ **موقوف** : لفظ کا آخری حرف جو وقف کی وجہ سے ساکن ہو جیسے مالیدہ میں ہ موقوف ہے۔ اسی طرح گوشت، پوست، سلام، کلام کے آخری حروف۔

☆ **تنوین**: ایک ہی حرف پر ایک قسم کی دو حرکت ہو یعنی دو زبر، دو زیر، یا دو پیش۔ جس حرف پر تنوین ہوتی ہے اسے مُنَوَّن کہتے ہیں۔ جیسے لفظ "احتیاطاً" میں "ط" منون ہے۔ اس کے پڑھنے کی شکل یہ ہوگی (احتیاطَن)

☆ تنوین صرف عربی الفاظ میں آتی ہے۔ جن لفظوں کے آخر میں گول "ۃ"، "ہ" کی شکل میں بدلی ہوئی ہوتی ہے، ان میں بہ حالت تنوین "ہ" پر دو نقطے لگا کر "ت" کی آواز پیدا کر دی جاتی ہے۔ جیسے واقعہ کی تنوین فتحی واقعۃً (واقعتَن) ہے۔

☆ دوسرے الفاظ میں بحالت تنوین فتحی "الف" بڑھا دیتے ہیں، جیسے "سہو" سے سہواً (سہوَن)۔ "دائم" سے دائماً (دائمَن)۔

☆ **تشدید**: اس کی شکل یہ ہے (ّ)۔ جس حرف پر یہ علامت بنائی جاتی ہے اس کی آواز دوہری ہو جاتی ہے۔ جیسے شدّت، مدّت، عزّت، رسّی، لغّو وغیرہ۔ جس حرف کی آواز دوہری ہوتی ہے اسے "مشدّد" کہتے ہیں۔

☆ **مد**: اس کے لغوی معنیٰ کھینچنے کے ہیں، مگر اصطلاح میں الف کو کھینچ کر پڑھنے کی علامت کو کہتے ہیں اس کی شکل یہ "ٓ" ہے۔ اور فارسی میں یہ علامت صرف الف پر

آتی ہے۔ ایسے الف کو الف ممدودہ کہتے ہیں، جیسے آمد، آلودہ۔ جس الف پر مد نہیں ہوتا اسے صرف ''الف'' کہا جاتا ہے۔ اور موسیٰ، عیسیٰ، اعلیٰ، اَولیٰ جیسے الفاظ کے آخر میں جو الف ہے اسے الف مقصورہ کہا جاتا ہے۔ بعض حضرات مد کی علامت والے الف کے علاوہ سب کو الف مقصورہ کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک - اگر - اِس - اُس - اہل - اصل - کا الف بھی الف مقصورہ ہے[1]۔

الف

اعلیٰ، ادنیٰ، عیسیٰ، موسیٰ

عربی کے کچھ لفظوں کے آخر میں جہاں الف کی آواز ہوتی ہے، وہاں بجائے الف کے ''ی'' لکھی جاتی ہے اور اس پر چھوٹا الف (الف مقصورہ[2]) نشان کے طور پر بنایا جاتا ہے۔ جیسے اعلیٰ، ادنیٰ، عیسیٰ، موسیٰ، دعویٰ، فتویٰ۔ اس قبیل کے بعض الفاظ اردو میں الف سے بھی لکھے جاتے ہیں، مثلاً مدعا، مولا۔ لیکن بعض دونوں طرح لکھے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ طریقہ زیادہ مناسب ہے کہ جو الفاظ اردو میں پورے الف سے لکھے جاتے ہیں اور ان کا یہ املا رائج ہو چکا ہے، وہ پورے الف سے لکھے جائیں۔ باقی تمام الفاظ کے قدیم املا میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں، یہ بدستور ''ی'' اور اس پر چھوٹے الف سے لکھے جائیں۔

---

[1] مگر عربی زبان میں الف کی شکل میں جو متحرک حرف ہوتا ہے اسے الف ہی نہیں مانتے بلکہ اسے ہمزہ مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ الف کبھی متحرک نہیں ہوتا۔ اہل عرب کے نزدیک ادب، اسد، تأمل، تأثر وغیرہ میں الف نہیں بلکہ ہمزہ ہے ہاں مال، حال، قال میں ان کے نزدیک بھی الف ہے۔

[2] یہاں الف مقصورہ سے مراد عربی زبان کا الف مقصورہ ہے۔
عربی میں الف ممدودہ اور الف مقصورہ کی تعریف اس طرح ہے۔
الف ممدودہ: وہ الف جس کے بعد ہمزہ ہو، جیسے: علماء، فضلاء، انبیاء، اولیاء وغیرہ۔
الف مقصورہ: وہ الف جس کے بعد ہمزہ نہ ہو، جیسے: اعلیٰ، ادنیٰ، تقویٰ، فتویٰ وغیرہ۔

پورے الف سے لکھے جانے والے الفاظ:

مولا مدّعا مدّعا علیہ مقتدا مقتضا[1]

یہ الفاظ چھوٹے الف سے لکھے جاتے ہیں۔ جیسے:

اعلیٰ ، ادنیٰ ، عیسیٰ ، موسیٰ ، یحییٰ ، مجتبیٰ ، مصطفیٰ ، مرتضیٰ

دعویٰ ، لیلیٰ ، تعالیٰ ، معلیٰ ، صغریٰ ، کبریٰ ، کسریٰ ، اولیٰ

منادیٰ ، مثنیٰ ، مقفیٰ ، طوبیٰ ، ہدیٰ ، معریٰ ، عقبیٰ ، تقویٰ

متبنیٰ ، حسنیٰ ، قویٰ ، مستثنیٰ ، حتیٰ کہ ، عہدِ وسطیٰ ، مجلس شوریٰ

یدِطولیٰ ، اردوے معلیٰ ، نصاریٰ ، یتامیٰ ، من و سلویٰ ، عیدالاضحیٰ ،

مسجدِ اقصیٰ ، سدرۃ المنتہیٰ ، شمس الہدیٰ۔

ذیل کے الفاظ کے رائج املا میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں:

اللہ الٰہ الٰہی

لفظ "اللہ" ایک خاص طرح لکھا جاتا ہے ، اس میں دو لام ہیں، ایک لام تو نمایاں ہوتا ہے، مگر دوسرے لام کی جگہ ایک شوشہ سا ہوتا ہے۔ یہ خاص نام ہے اور اس کی یہی صورت متعارف ہے اس لیے اس کو اسی طرح لکھنا چاہیے۔ ایک صورت "للہ" ہے۔ (نسخ میں اس کو "للّٰہ" لکھا جائے گا) کہا جاتا ہے "للہ، تم یہ کام نہ کرو"۔ اس کو کبھی کبھی "لللہ" لکھ دیا جاتا ہے، یہ سمجھ کر کہ "للہ" میں تو ایک ہی لام آیا ہے، مگر یہ درست نہیں۔ "للہ" میں دو لام ہیں، ایک نمایاں اور ایک شوشے کی صورت میں۔

"اللہ" کی طرح "الٰہ" بھی الف کے بغیر لکھا جاتا ہے، اسی سے "الٰہی" بنتا ہے۔ ان دونوں لفظوں کی یہ مانوس صورت ہے، اس لیے ان کو بھی اسی طرح لکھنا چاہیے۔

[1] ان الفاظ کی فہرست میں تقاضا، تماشا، تمنا، تولّا، تبرّا کو شمار کرنا درست نہیں، اس لیے کہ یہ اپنی عربی اصل میں ی سے تقاضی، تماشی، تمنّی، تولّی، تبرّی ہیں۔ اہلِ فارس نے "ی" کو الف سے بدل کر استعمال کیا پھر یہ فارسی سے اردو میں منتقل ہوئے تو ان کا وہی فارسی املا برقرار رہا۔

اسی طرح الٰہ آباد، بارالٰہ، الٰہی بخش، ولی الٰہی، الٰہیات بھی جوں کے توں لکھے جائیں گے۔

عربی مرکبات

عربی کے مرکبات جب اردو میں منقول ہوں تو عربی طریقے کے مطابق لکھے جائیں۔ مثلاً

	بالعموم	بالفرض	بالفعل	بالمشافہہ
بالعکس	بالضرورۃ	بالخصوص	حتی الامکان	حتی الوسع
حتی المقدور	علی الصّباح	علی التواتر	علی الاطلاق	علی الاتصال
علی الرغم	علی العموم	علی الخصوص	علی ہٰذا القیاس	علی الدوام
علی حالہٖ	علی الاعلان	علی وجہ البصیرۃ	علی وجہ التفصیل	علی وجہ العموم

اگر ممکن ہو تو ان مرکبات کا اردو مفہوم عبارت میں استعمال کیا جائے اور یہ کوئی مشکل نہیں ۔ مثلاً علی الصباح کے بجائے صبح تڑکے، علی الرغم کے بجائے برعکس، برخلاف، علی العموم کے بجائے عام طور پر یا عموماً لکھا جاسکتا ہے۔ وغیرہ

رحمٰن، اسمٰعیل

بعض عربی الفاظ میں چھوٹا الف درمیانی حرف پر لگایا جاتا ہے، جیسے اسمٰعیل، رحمٰن، ان میں سے کئی لفظ اردو میں پورے الف سے لکھے جاتے ہیں مثلاً:

ابراہیم	سلیمان	مولانا
اسحاق	لقمان	اسماعیل

البتہ جب ایسا کوئی لفظ قرآن پاک کی سورتوں کے نام یا اللہ کے اسماے صفات کے طور پر استعمال ہوگا تو اس کا اصلی املا برقرار رہے گا۔ خصوصاً لفظ رحمٰن ہمیشہ چھوٹے الف سے لکھنا چاہیے۔ عربی ترکیب میں بھی اصلی املا برقرار رہنا چاہیے۔ جیسے: رحمٰن، مرکب کی صورت میں مثلاً عبد الرحمٰن (چھوٹے الف کے ساتھ) لکھا جائے گا۔ عبدالرحمان (پورے الف کے ساتھ) لکھنا میرے خیال میں

درست نہیں، اس لیے کہ عربی تحریر میں اس جگہ پورا الف نہیں لکھا جاتا۔ یحییٰ، موسیٰ، عیسیٰ یہ انبیاے کرام کے نام ہیں ان کا یہ املا مانوس ہے، ان اسما کو پورے الف کے ساتھ (یحیا، موسا، عیسا) لکھنا صحیح نہیں۔

علٰحدہ، اعلٰحضرت، مولٰینا

علٰحدہ یا علٰیحدہ کو علاحدہ لکھنا چاہیے، اسی طرح علاحدگی بھی۔

اعلٰیحضرت، اعلٰحضرت یہ طریقے بہتر نہیں، درست املا ''اعلیٰ حضرت'' ہے۔ اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔

مولٰینا، مولٰنا کو ''مولانا'' لکھنا چاہیے کہ جدید املا یہی ہے۔ اور اعلٰحضرت، مولٰنا تو بالکل غلط ہیں کہ ان میں ''ی'' کا شوشہ ہی غائب ہے۔

لہٰذا

لفظ ''لہٰذا'' کی بھی رائج صورت میں تبدیلی کی ضرورت نہیں، کیوں کہ یہ لفظ اس املا کے ساتھ پوری طرح چلن میں ہے۔ اور کسی کو بھی اس طرح لکھنے میں کوئی تکلف بھی نہیں ہوتا۔

تمغہ، تمغا

بعض الفاظ ''ہ'' سے لکھے جاتے ہیں۔ اس بارے میں اصول یہ ہونا چاہیے کہ جو الفاظ ''ہ'' سے رائج ہو چکے ہیں، ان کا املا ''ہ'' سے مان لینا چاہیے، باقی الفاظ کو الف سے لکھنا چاہیے:

ذیل کے الفاظ ''ہ'' سے صحیح ہیں:

تمغہ، چغہ، قورمہ، ناشتہ، ملغوبہ، چلغوزہ، کمرہ

ذیل کے الفاظ الف سے لکھے جائیں:

عاشورا[1] حلوا معما تماشا تقاضا مچلکا بقایا

بالکل، بالترتیب

ایسے مرکب لفظ اردو میں اچھی خاصی تعداد میں ہیں جو عربی قاعدے کے مطابق الف لام (ال) کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ ایسے مرکبات کی دو صورتیں ہیں، ایک وہ جس میں الف لام حروف شمسی (ت، ث، د، ذ، ر، ز، س، ش، ص، ض ط، ظ، ل، ن) سے پہلے آتا ہے اور بعد کا حرف مشدد بولا جاتا ہے تو الف لام آواز نہیں دیتا مگر لکھا ضرور جاتا ہے، جیسے عبد السّتّار، بالتّرتیب، شجاع الدّولہ، عبد الرزّاق، فخر الدّین، قمر النّساء۔ دوسرے وہ جس میں الف لام حروف قمری (ب، ج، ح، خ، ع، غ، ف، ق، ک، م، و، ہ، ی) سے پہلے آتا ہے تو لام تلفظ میں شامل رہتا ہے، جیسے: فی الحال، بالکل، انا الحق، بالفعل، ملک الموت، عبد الجبار، عبد الغفار

یہاں ایک بات اور یاد رکھنی ضروری ہے کہ جب الف لام والے کسی لفظ پر (ب) آتا ہے تو اسی الف کے ساتھ (ب) کو جوڑ دیتے ہیں لہذا اس کے بعد اب ایک الف مزید لکھنا غلط ہے۔ یہ غلطی اکثر طلبہ سے سرزد ہوتی رہتی ہے۔

الف ممدودہ

فارسی الف ممدودہ کا مسئلہ صرف مرکبات میں پیدا ہوتا ہے۔ یعنی ''دل آرام'' لکھا جائے یا ''دلارام''۔ اس میں مناسب یہ ہے کہ جس کو جیسے لکھا جاتا ہے اس کو باقی رکھا جائے، مثلاً

بغیر مد کے لکھے جانے والے مرکبات:

برفاب	تیزاب	سیلاب	غرقاب	سیماب
زہراب	خوشامد	دستاویز	گلافتاب	تلخاب
سردابہ	گرمابہ	مرغابی		

[1] عاشورا، حلوا، یہ دونوں لفظ عربی ہیں، عربی میں ان کا پورا املا یہ ہے۔ عاشوراء، حلواء۔ دوسرے الفاظ کی طرح انہیں بھی اردو میں ہمزۂ آخر کے حذف کے ساتھ لکھنا کافی ہے۔ الف کو ''ہ'' سے بدل کر عاشورہ، حلوہ لکھنے کا یہاں کوئی قاعدہ نہیں۔

مد کے ساتھ لکھے جانے والے مرکبات:

گرد آلود	دل آویز	عالم آرا	جہان آباد	دل آرا	دل آرام
دوآبہ	ابر آلود	خمار آلود	قہر آلود	زہر آلود	زنگ آلود
خون آلود	رنگ آمیز	درد آمیز	جہاں آرا	حسن آرا	خانہ آباد
عشق آباد	مراد آباد	محمد آباد	فیض آباد	شاہ آباد	

تنوین

اردو میں عربی کے ایسے کئی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن پر دوز بر آتے ہیں، جیسے فوراً، عموماً، خصوصاً، اتفاقاً۔ تنوین اردو املا کا حصہ بن چکی ہے اس لیے اسے بدلنا مناسب نہیں۔ چناں چہ ''فوراً'' کو ''فورن'' لکھنا کسی طرح مناسب نہیں، اس کو تنوین کے ساتھ ''فوراً'' لکھنا ہی صحیح ہے۔

عربی کی گول ''ۃ'' اردو میں جہاں لمبی ''ت'' لکھی جاتی ہے وہاں تنوین کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا بہتر ہوگا کہ ان سب لفظوں کے آخر میں الف کا اضافہ کر کے تنوین لکھی جائے۔ مثلاً

نسبتاً	مروّتاً	عادتاً	ضرورتاً	ارادتاً	فطرتاً	شکایتاً
قدرتاً	حقیقتاً	حکایتاً	طبیعتاً	شریعتاً	طاقتاً	مصلحتاً
حقارتاً	وراثتاً	صراحتاً	عقیدتاً	وضاحتاً	شرارتاً	

جہاں تائے مدورہ ''ۃ'' کو اسی طرح لکھتے ہیں اور لمبی ''ت'' نہیں بناتے وہاں تنوین کے وقت صرف نقطہ دے کر زبر لکھا جائے جیسا کہ رواج چلا آرہا ہے۔ مثلاً:

کلیۃً، اشارۃً، کنایۃً، واقعۃً، دفعۃً، نتیجۃً، تحفۃً۔

پہلی قسم کے الفاظ کو بھی اگر گول ''ۃ'' پر تنوین دے کر قدیم رواج کے مطابق لکھا جائے تو حرج نہیں۔ مثلاً عادۃً، فطرۃً، حقیقۃً، نسبۃً۔ لیکن ''وقت'' میں ''ت'' مادے کا حرف ہے اس لیے اسے الف کے ساتھ ہی لکھنا چاہیے۔ جیسے: وقتاً، فوقتاً۔

ت ، ۃ

اردو کے حروف تہجی میں تاے مدورہ والے الفاظ کو بغیر نقطے کی گول ''ہ'' سے لکھا جاتا ہے۔ جیسے واقعہ، حادثہ، مرتبہ۔ یا۔ لمبی ''ت'' کے ساتھ لکھا جاتا ہے جیسے نسبت، حقیقت، عزت، منزلت۔ نقطے والی گول ''ۃ'' کا رواج نہیں۔ ہاں! ان الفاظ کو تنوین کے ساتھ لکھنا ہو تو گول ''ۃ'' مع تنوین مثلاً واقعۃً، اشارۃً، فطرۃً کا استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ بیان ہوا۔ لیکن گنتی کے چند عربی الفاظ ''ۃ'' سے اردو میں بھی لکھے جاتے ہیں۔ جیسے:

صلاۃ زکاۃ مشکاۃ[1]

رواج کے پیش نظر ان چند الفاظ کو اسی طرح نقطے والی گول تا سے برقرار رکھنا مناسب ہے، باقی الفاظ جو لمبی ''ت'' سے رواج میں آ چکے ہیں انھیں لمبی ''ت'' سے ہی لکھا جائے۔ جیسے:

حیات نجات بابت منات مسمات توریت

ت ، ط

اردو میں کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جو کبھی ''ت'' سے لکھے جاتے ہیں اور کبھی ''ط'' سے، ان کے املا میں احتیاط کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ ''ط'' عربی زبان کا حرف ہے جب بھی استعمال ہوگا تو عربی لفظوں میں۔ لیکن غیاث اللغات میں خان آرزو کی خیابان سے نقل ہے کہ: اہل فارس نے بھی عربی کے زیر اثر بعض الفاظ مثلاً طپانچہ، طپیدن، طلا کو ''ط'' سے لکھا ہے'' اس لیے ہونا یہ چاہیے کہ ایسے الفاظ جن کا فارسی

---

[1] انفرادی حالت میں ان الفاظ کا اصل املا واو کے ساتھ ہے۔ صلوٰۃ ، زکوٰۃ ، مشکوٰۃ ۔ مگر اب عربی تحریروں میں بھی واو کی پابندی نہ رہی۔ واو کے بدلے پورا الف بے تکلف لکھا جانے لگا ہے تو اردو میں واو کی پابندی کیوں رہے؟ جب کہ اردو کا مزاج پورے الف کا متقاضی ہے۔ ہاں! ہمیں اس سے انکار نہیں کہ عربی میں واو والا املا بالکل متروک نہیں۔ بعض حضرات مذکورہ الفاظ کو واو سے اب بھی لکھتے ہیں۔

اور اردو املا ''ط'' سے رائج اور معروف ہو چکا ہے (مثلاً طمانچہ، طمنچہ، طشت، طوطی، طوطا) انھیں ''ط'' ہی سے لکھا جائے باقی الفاظ اصل کے مطابق ''ت'' سے لکھے جائیں۔ جیسے:

تپش تپاں تیار تیاری ناتا (رشتہ)

ذ، ز، ژ۔

● ''ذ'' ''ز'' اور ''ژ'' ان حرفوں کے سلسلے میں املا کی بہت غلطیاں ہوا کرتی ہیں۔ کبھی کبھی تو لفظ کے معنی ہی بدل جاتے ہیں؛ اس لیے اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

زرتشت : آتش پرستوں کے پیغمبر کا نام۔ (اس کو زردشت بھی لکھتے ہیں)

زکریا : مشہور پیغمبر کا نام۔

زخّار : جیسے: بحرِ زخّار۔

آزوقہ : تھوڑی سی غذا۔

آزر : حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کے بڑے بھائی کا نام۔

جزر : جزر ومد، جس کے معنی ہیں: جوار بھاٹا، اتار چڑھاو۔

اوپر جو الفاظ لکھے گئے ہیں، ان سب میں ''ز'' ہے۔ اب وہ الفاظ لکھے جا رہے ہیں جن میں ذال ہے:

آذر: بمعنی: آگ۔ آذر پرست بمعنی: آتش پرست۔ آذر کدہ: آتش کدہ۔

آذربایجان: ایک شہر کا نام۔

جذب: اسی سے ''جاذب'' بنتا ہے، جس کے ایک معنی ہیں ''سیاہی چوس'' اسے بلاٹنگ پیپر بھی کہتے ہیں۔ مجذوب، جذبہ، جذبات سب اسی سے بنے ہیں۔

ابوذر: ایک مشہور صحابی کا نام۔

ذیابیطس: ایک بیماری کا نام۔

ذی: جیسے: ذی شان ، ذی علم، ذی فہم۔

بذلہ: لطیفہ ، چٹکلا، مرغوب بات۔

ذرا: یہ ''ذرّہ'' سے بنا ہے، جیسے ''ذرا سی بات''۔

نذیر: ڈر سنانے والا، یہ رسول اللہ ﷺ کا صفاتی نام ہے۔

ناموں میں عموماً ''نذیر'' ہی ہوتا ہے، جیسے: نذیر احمد، نذیر حسن، نذیر محمد، وغیرہ۔
ایک دوسرا لفظ ہے ''نظیر''، اس کے معنی ہیں: مثل، طرح۔ اسی سے ''بے نظیر'' بنتا ہے، جس کے معنی ہیں: بے مثل۔ تخلص کے طور پر ''نظیر'' آتا ہے، جیسے: نظیر اکبر آبادی، نظیر لدھیانوی۔

نذر: نذر، نذرانہ، نذر و نیاز، نذر ماننا، نذر چڑھانا، نذر کرنا (جیسے: یہ کتاب آپ کی نذر ہے) ان سب میں ''نذر'' آیا ہے۔

جذر: علم حساب کی ایک اصطلاح ہے۔

جذام: کوڑھ۔ جذامی: کوڑھی۔

رذیل: رذالت، رذالہ، سب میں ''ذ'' ہے۔

- گذشتن، گذاشتن، گذاردن، گزاردن

فارسی کے ان مصادر کے مشتقات اردو میں اکثر استعمال میں آتے ہیں۔ ان کے املا میں بڑا خلط ملط ہوتا ہے۔ ان شاء اللہ ذیل کی سطریں ایک مناسب طریقے کی رہنمائی کریں گی۔

(۱) گذشتن بمعنی گذرنا، عبور کرنا۔ یہ لفظ ''ذال'' سے ہے، یہ اور اس کے مشتقات ''ذ'' سے لکھے جائیں گے۔ جیسے: گذشتہ: گذرا ہوا — یاران گذشتہ: وہ دوست جو اس دنیا سے جا چکے — سرگذشت: گذری ہوئی باتیں، روداد — راہ گذر: راستہ — عمر گذراں: گذری ہوئی عمر — گذرگاہ: راستہ، گذرنے کی جگہ۔

(۲) گذاشتن بمعنی چھوڑنا۔ غیاث اللغات میں جہانگیری اور سراج اللغات کے حوالے سے ہے کہ ''گذاشتن'' ذال معجمہ اور زائے معجمہ دونوں سے لکھنا درست ہے۔

یعنی گذاشتن اور گزاشتن۔ جیسے: راہ گذار، راہ گزار۔ نیزہ گذار، نیزہ گزار۔ وا گذاشت، واگزاشت۔ فروگذاشت، فروگزاشت۔

(۳) گذاردن: ادا کرنا، پیش کرنا۔ بعض محققین نے لکھا ہے کہ ''گذاردن'' ''ذال معجمہ'' سے بمعنی ترک کرنا، اور ''زاے ہوز'' سے بمعنی ادا کرنا ہے۔ (غیاث اللغات)

(۴) گزاردن: ادا کرنا۔ بزاے ہوز ــــ عبدالواسع کی شرح بوستاں میں ہے کہ ''گزاردن'' بمعنی ''ادا کرنا'' زاے ہوز سے ہے اور ''گذاردن'' بمعنی ''ترک کرنا'' ''ذال معجمہ'' سے ہے۔

میر نوراللہ احراری نے شرح گلستاں میں لکھا ہے کہ ''گذاردن'' بمعنی رہا کرنا اور ترک کرنا جو عوام میں ''ذال معجمہ'' سے مشہور ہے، غلط ہے۔ صحیح ''زا'' سے ہے۔ (غیاث اللغات)

گذاردن ''بذال معجمہ'' اور گزاردن ''بزاے ہوز'' ان دونوں الفاظ کے معانی صاحب غیاث اللغات، ''ادا کرنا اور پیش کرنا'' بتاتے ہیں۔ ساتھ ہی اہل تحقیق کا نظریہ، یہ پیش کرتے ہیں کہ ''گذاردن'' ذال معجمہ کے ساتھ ''ترک کرنا'' کے معنی میں ہے اور ''زاے ہوز'' سے ''ادا کرنا'' کے معنی میں۔

میر نوراللہ احراری کا خیال ہے کہ ''گزاردن'' بمعنی رہا کرنا اور ترک کرنا، زاے ہوز سے صحیح ہے۔

محققین کے اس اختلاف کی وجہ سے ان الفاظ اور ان کے مشتقات کے املا میں ایک زبردست اختلاط کی راہ کھل رہی ہے۔ ''شکر گزار'' لکھیں یا ''شکر گذار'' اس میں کس کا معنی ''شکریہ ادا کرنے والا'' کریں اور کس کا معنی ''شکر ترک کرنے والا''۔

اس طرح کے اور دوسرے الفاظ میں بھی املا کا خلجان ہوگا۔ مثلاً:

عبادت گزار، عبادت گذار۔ تہجد گزار، تہجد گذار۔ خدمت گزار، خدمت گذار۔ مال گزار، مال گذار۔

اس لیے مناسب ہے کہ جہاں چھوڑنے اور ترک کرنے کا معنی ہو وہاں ''ذال'' والی صورت اختیار کی جائے اور جہاں ادا کرنا اور پیش کرنے کا معنی ہو وہاں ''زاے

ہوز'' والی صورت اپنائی جائے جیسا کہ عام محققین کا خیال ہے۔

یہ صورت اختیار کرنے میں ان کے درمیان املا کا اختلاط ختم ہو جائے گا اور املا نویس کے لیے بڑی سہولت ہوگی۔ اس طرح ادا کرنا اور پیش کرنا کے معنی میں املا کی صورت یہ ہوگی:

نماز گزار، تہجد گزار خدمت گزار مال گزار
شکر گزار عبادت گزار عرض گزار گزارش

اور چھوڑنے اور ترک کرنے کے معنی میں یہ صورت:

حرص گذار صبر گذار وقت گذار فخر گذار

● ''پذیرفتن'' کے معنی ہیں: قبول کرنا۔ اس میں ''ذ'' ہے اس سے بننے والے الفاظ ذال سے لکھے جائیں گے۔

فارسی لغات مثلاً برہان قاطع اور غیاث اللغات وغیرہ میں ''پذیرفتن'' اور اس کے مشتقات ''ذ'' ہی سے لکھے گئے ہیں، اس لیے یہی املا برقرار رکھنا چاہیے، تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں، جیسے:

پذیرفتہ، پذیرا، پذیرائی، دل پذیر، اثر پذیر، رقم پذیر، خلل پذیر۔

اور یہ کہنا کہ فارسی میں ''ذ'' کوئی حرف نہیں، غلط ہے۔

اردو کے مصدر گزرنا، گزارنا سب میں ''ز'' ہے۔ ان سے جتنے لفظ بنیں گے، سب میں لازماً ''ز'' لکھی جائے گی کہ یہ سب مستقلاً اردو کے مصدر ہیں اس لیے ان کی تمام تصریفی شکلیں ''ز'' سے لکھنی چاہیے جیسے:

گزرا، گزرا ہوا، گزرتے رہنا، گزار دینا، گزار لینا، گزارا، گزر بسر۔

● عربی کا ایک لفظ ہے ''اِزدِحام'' اس کو کبھی ''ازدہام'' اور کبھی ''اژدہام'' بھی لکھا جاتا ہے، یہ سب غلط صورتیں ہیں۔ صحیح صورت ''ازدحام'' ہے۔

رضائی: - ''رزائی'' لکھا جائے یا ''رضائی''۔ بہتر یہ ہے کہ ''رضائی'' بکثرت رائج ہو چکا ہے اس لیے اسی کو ترجیح دینا چاہیے۔

ایک لفظ ہے "رضاعی" اس کا معنی دودھ کے رشتے والا ہے یہ بہر حال "ض" اور "ع" ہی سے لکھا جائے گا۔

● ژ: فارسی کا خاص حرف ہے، ذیل کے چند الفاظ دیکھیں ان میں "ژ" کا استعمال ہے انھیں اردو میں بھی ایسے ہی لکھا جائے گا۔

آژخ : سیاہ رنگ کا مسّا جو آدمی کے جسم پر نکلتا ہے۔
اژدر : بڑا سانپ۔
اژدرہا : بڑا سانپ (یہ لفظ واحد ہے "اژدر" کی جمع نہیں)
اژدہا : بڑا سانپ۔
پژمردہ : مرجھایا ہوا۔
پژوہ : پژوہیدن بمعنی تلاش کرنا، فکر کرنا، سے صیغۂ امر ہے (حق پژوہ)
ژالہ : اُولا (ژالہ باری)
ژاژ : ایک گھاس کا نام۔ بدمزہ۔
ژاژ خائے : وہ شخص جو بے ہودہ، بے معنی اور بے فائدہ باتیں کرے۔
ژرف : عمیق، گہرا، اسی سے "ژرف نگاہ" بنا ہے۔ (گہری نظر والا)
ژندباف : بلبل، قُمری، فاختہ اور ان ہی کی طرح خوش آواز پرندے۔
ژولیدہ : پریشان، درہم برہم۔
مُژدہ : خوش خبری، بشارت۔
مُژدگانی : وہ نقد یا جنس (چیز، سامان) جو خوش خبری پہنچانے والے کو دیں۔
مِژہ : آنکھ کی پلک۔
مِژگاں : "مژہ" کی جمع۔
نژاد : اصل، نسب (حور نژاد)
نوخار : بانگ، فریاد، نعرہ۔
نژم : گہرا، کہیسا۔

انگریزی کے چند الفاظ جن میں "ژ" کا استعمال ہے:

بُورژوا : (Bourgeoisie) سرمایہ دار، متوسط شہری۔

ٹیلی ویژن : (Television)

س، ش، ص

"س" خواہ نقطے والی ہو یا بے نقطہ، دونوں طرح سے لکھی جاتی ہے دندانے دار اور کشش دار۔ جب یہ کسی لفظ میں تنہا آئے تو اختیار ہے جس طرح چاہیں لکھیں جیسے حسن، حسن، لیکن اگر اس کے معاً بعد یائے مجہول (ے) ہو تو دندانے دار لکھنا چاہیے اور کشش دار سے پرہیز کرنا چاہیے کہ اسی میں خوب صورتی ہے۔ اور اگر کسی لفظ میں دو (س) بلافصل جمع ہو جائیں تو پہلی کو کشش دار اور دوسری کو دندانے دار لکھنا چاہیے کیوں کہ اسی میں خوب صورتی ہے جیسے:

کوشش، کشش، سسرال، سستا، ششدر۔

درج ذیل صورتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔

کوشش، کوشش، کشش، کشش، سسرال، سسرال، سستا، سستا، ششدر، ششدر۔

دندانے دار کبھی شروع یا درمیان میں آتی ہے تو بے توجہی یا جلد بازی کی وجہ سے ایک دندانہ غائب ہو جاتا ہے اور کبھی بڑھ بھی جاتا ہے، اس پر خاص طور سے توجہ کی ضرورت ہے۔ جیسے: مست، مست، سنت، سنت، ستمبر، ستمبر، شروع، سر وغیرہ

ان الفاظ کا صحیح املا یہ ہے۔ مست ، سنت، ستمبر، شروع، سر۔

س، ص

مسالا: دہلی میں "مصالحہ" تھا۔ لکھنؤ میں "مسالا" ہو گیا۔ اسی لکھنوی صورت کو اختیار کرنا چاہیے۔

مِسل: روداِدِ مقدمہ کے معنی میں اس کا املا "س" سے رائج ہے، اسی کو اپنانا چاہیے۔

قفس: یہ لفظ سین اور صاد کے ساتھ دونوں عربی ہے۔ فارسی میں دونوں سے مستعمل ہے۔ لیکن اردو میں صرف سین سے لکھا جاتا ہے، اس لیے اردو میں

اسی کو اختیار کیا جائے۔

قصائی : "ص"، "س" دونوں کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا رائج املا "ص" سے ہے، اس لیے اسی کو ترجیح حاصل ہے۔

ص کے سلسلے میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ شوشہ اس کا جز ہے، اس لیے شوشہ حذف کر دینے سے املا غلط ہو جائے گا۔ یہ لفظ کے شروع میں ہو یا درمیان میں شوشہ ہر حال میں ضروری ہے۔ جیسے مصباح، مصباحی، صبح، صیاد، مصیبت، نصیحت، وغیرہ اگر کلمات بغیر شوشہ کے مثلاً: مصباح، مصباحی، نصحت، مصبت، صیاد صبح لکھے جائیں تو غلط ہوگا۔

نون اور نون غُنّہ [1]

ا:- گنبد، انبار، دنبہ، سنبل

عربی یا فارسی کے کسی لفظ میں "ن" کے بعد "ب" ہو تو "ن" کی آواز "م" میں بدل جاتی ہے، لکھنے میں تو "ن" ہی آتا ہے لیکن پڑھا "م" جاتا ہے۔ جیسے:

گنبد، انبار، جنبش، دنبہ، شنبہ، تنبورہ، سنبل، عنبر، کنبہ، جنبہ، انبوہ، پنبہ، تنبولی، چنبر (سرپوش)، حنبل، ذنب (گناہ)، زنبیل، زنبور، قُنبلہ وغیرہ۔

مگر ہندی اور انگریزی کے الفاظ میں ایسے مقامات پر "م" ہی لکھا جائے گا۔ جیسے:

تمباکو، امبولینس، کھمبا، امبیسی، ستمبر، اچمبھا، چمپا، امبر (بمعنی آسمان)

---

[1] نون تین طرح کا ہوتا ہے: (۱) نون ملفوظی یا نون ظاہر (۲) نون غنہ (۳) نون شبہ غنہ۔

(۱) نون ملفوظی یا نون ظاہر: وہ نون ہے جو پورے طور پر ادا کیا جائے، جیسے: اَن، بن، تن، من۔

(۲) نون غنہ: وہ نون ہے جس کی آواز گنگناہٹ لیے ہوتی ہے۔ جیسے: یہاں، وہاں۔

(۳) نون شبہ غنہ: وہ نون ہے جس کی آواز نہ تو نون ظاہر کی طرح ہو اور نہ پوری گنگناہٹ کے ساتھ پیدا ہو۔ یہ نون عموماً "کاف" یا "گاف" سے پہلے آتا ہے۔ جیسے: لنکا، گنگا۔

فائدہ: جب نون غنہ لفظ کے آخر میں آتا ہے تو اس کے پیٹ میں نقطہ نہیں دیتے۔ جیسے یہاں، وہاں۔ لیکن جب درمیان میں آتا ہے تو نقطہ دیتے ہیں۔ جیسے: بھنور، پانچ۔

(زبدۃ القواعد۔ ص: ۱۰، ۱۱۔ از ڈاکٹر زبیداحمد)

یہاں دو لفظ "منبر" اور "ممبر" خاص طور سے توجہ کے طالب ہیں جو اردو میں عام طور سے استعمال ہوتے ہیں، ان کی لکھاوٹ تو مختلف ہے لیکن تلفظ ایک ہے۔ اس لیے ان کے املا میں غلطیاں بھی ہوتی رہتی ہیں، منبر کو ممبر اور ممبر کو منبر لکھ دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اوپر بیان کیا گیا اصول ذہن میں رکھنا چاہیے کہ عربی اور فارسی کے الفاظ میں نون کے بعد "ب" ہو تو لکھنے میں "ن" آئے گا اور آواز "م" کی ہوگی، مگر انگریزی اور ہندی میں "م" پڑھا جائے گا تو "م" ہی لکھا بھی جائے گا۔ منبر عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں وہ بلند مقام جس پر خطبہ پڑھا جاتا ہے اور وعظ وتقریر کی جاتی ہے۔ ممبر انگریزی لفظ ہے جس کا معنی ہے رکن۔ جیسے پارلیمنٹ کے رکن کو ممبر کہا جاتا ہے۔

۲:۔ گننا، سننا

اردو میں کئی مصدر ایسے ہیں جن میں دو "ن" ہیں، جیسے بننا، گننا، سننا۔ ان میں ایک "ن" تو مادۂ فعل ہے، دوسرا علامتِ مصدر (بُن + نا، گِن + نا، سُن + نا) غلطی سے ایسے مصدروں کو مشدّد "ن" سے لکھ دیا جاتا ہے جیسے: بنّا، گنّا، سنّا وغیرہ۔ یہ درست نہیں۔ دو نون کے ساتھ لکھنا صحیح ہے۔

اگر لفظ ایسے دو کلموں سے مرکب ہے جس کے پہلے کلمہ کا آخری اور دوسرے کلمہ کا پہلا حرف ہم جنس ہو تو اس صورت میں وہ حرف مشدد کے بجائے دوبارہ لکھا جائے گا۔ اس میں "ن" کی تخصیص نہیں کوئی بھی حرف ہو۔ جیسے: اس سے، جس سے، تم میں، وغیرہ۔ ان کو اسّے، جسّے، تمّیں لکھنا درست نہیں۔ لیکن یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ الگ حروف لکھے جانے کے باوجود ان کا تلفظ ملا کر ہوگا الگ الگ بولنا غلط ہے۔ جیسے ؎

دور و نزدیک کے سننے والے وہ کان
کانِ لعلِ کرامت پہ لاکھوں سلام

اسے "سنّے" کے تلفظ کے ساتھ پڑھیں علاحدہ علاحدہ پڑھنا صحیح نہیں۔

یہ قاعدہ عربی، فارسی، اردو اور ہندی سب میں یکساں ہے، اس کو ادغام کہتے ہیں۔

۳:- گانو، پانو، گاؤں ، پاؤں

اردو میں یہ الفاظ کئی طرح سے لکھے جاتے ہیں جیسے گانو، گاؤں، گانوں، گانؤں۔اس انتشار کو دور کرنے کے لیے ان کا ایک املا اختیار کرنا ضروری ہے۔گانو، پانو واو پر غنہ کی تقدیم کے ساتھ ان لفظوں کا قدیم املا ہے جس کو اردو ترک کر چکی ہے۔ اس لیے ایسے تمام لفظوں کو آخر ہی میں نون غنہ سے لکھنا مناسب ہے۔مثلاً:

گاؤں پاؤں چھاؤں

۴:- منہدی، مہندی

لغت میں اس کا املا دونوں طرح ملتا ہے،لیکن بہتر یہ ہے کہ پہلی صورت (منہدی) اختیار کی جائے، اس لیے کہ پڑھنے میں پہلے نون غنہ اس کے بعد ''ہ'' کی ادائیگی ہوتی ہے۔بعض لغت نویس اور محتاط دانشوروں کی تحریر سے اس کی تائید ہوتی ہے۔اسی طرح منہگا،لنہگا کو بھی تلفظ کے مطابق لکھنا مناسب ہے خصوصاً جب کہ یہ بھی رواج میں رہا ہے یعنی''م'' کے بعد''ن'' پھر''ہ''۔

یہاں ایک لفظ''مہدی'' ہے جو عربی ہے اور بغیر غنہ کے''م'' پر فتحہ کے ساتھ ہے عموماً ناموں اور القاب میں یہی عربی لفظ ہوتا ہے جیسے: مہدی حسن، امام مہدی رضی اللہ تعالی عنہ۔

۵:- چانول، گھانس

ذیل کے الفاظ نون غنہ کے ساتھ متروک ہیں۔ان کو نون غنہ کے بغیر لکھنا چاہیے:

چاول ، گھاس ، سوچنا ، پھوس ، کوچہ

اور ذیل کے الفاظ نون غنہ کے ساتھ صحیح ہیں:

کینچلی ، جھونپڑا ، کنواں ، جھینگا ، جھینگر ، چھینٹ۔

واو

۱:- اوس ، اودھر

قدیم اردو میں پیش ظاہر کرنے کے لیے واو لکھتے تھے، مثلاً: اوس ، اودھر ، اوٹھنا ، مونہہ

ایسے تمام الفاظ اب بغیر واو کے لکھے جاتے ہیں۔ یہی املا بہتر ہے۔ ایسے ہی ''دوکان'' نہیں بلکہ ''دکان'' بغیر واو کے ہی صحیح ہے۔

۲:- لوہار، سنار

اردو میں لوہار واؤ کے ساتھ (اصل کے مطابق) اور لہار بغیر واؤ کے (تخفیف کے ساتھ) دونوں صحیح ہے، مگر زیادہ رائج لوہار واو کے ساتھ ہے اس لیے یہی راجح ہے۔ البتہ سنار بغیر واو کے رائج ہے اس لیے اس میں یہی صحیح ہے۔ بعض دوسرے الفاظ جن میں واو لکھنے کی ضرورت نہیں، نیچے درج ہیں:

پہنچنا، پہنچانا، پہنچ ، بڑھاپا ، اُدھار ، دُلارا ، دُلاری ، دُلار ، دُلھن، دُہرا ، مُٹاپا، نکیلا۔

۳:- ہندوستان ، ہندستان

دونوں صحیح ہیں البتہ ''ہندستان'' بغیر واو کے نثر میں نہیں استعمال کرنا چاہیے اور نظم میں چوں کہ کبھی کچھ مجبوریاں سامنے آجاتی ہیں، اس لیے وہاں بوقت ضرورت بغیر واو کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

۴:- جز ، جزو

''جز'' کے معنی ہیں: ٹکڑا۔ عربی میں ''جزء'' تھا اردو میں ''جز'' رہ گیا۔ اسی سے ''جزئی'' اور ''جزئیات'' بنتے ہیں۔ فارسی میں اسی سے ''جزو'' بنا ہے۔ جب یہ لفظ فارسی ترکیب کے اعتبار سے مضاف یا موصوف ہو تو اسے واو کے ساتھ لکھنا

چاہیے۔ جیسے: جزوِ بدن، جزوِ خاص۔ مفرد صورت میں دونوں طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مگر اچھا یہ ہے کہ اس صورت میں واو کے بغیر ''جز'' لکھا جائے جیسے،

ع: جز، مرتبۂ کل کو حاصل کرے ہے آخر

اسی سے جز دان، جز رسی، جز بندی بنتے ہیں۔

اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ لفظ ''کلی'' کے مقابلے میں ''جزئی'' لکھیں ورنہ ''جزوی''، جیسے: یہ بات جزوی طور پر ٹھیک ہے۔

''جز'' جس کے معنی ہیں ''سوا''، وہ فارسی کا لفظ ہے اور اسی طرح مستعمل ہے جیسے:

ع جز قیس اور کوئی نہ آیا بروے کار۔ ع جز ترے کچھ نظر نہیں آتا۔

۵:- روپے ، روپیہ

ان لفظوں کو کئی طرح لکھا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ رائج املا روپیہ، روپے ہے، یہی املا اختیار کرنا چاہیے۔ روپئے غلط ہے۔

۶:- دُگنا ، دوگنا

یہ دو الگ الگ لفظ ہیں، ان کو اسی طرح لکھنا چاہیے۔ اس بارے میں اصول یہ ہے کہ وہ مرکب الفاظ جن کا پہلا جز ''دو'' ہے واو کے ساتھ لکھے جاتے ہیں، جیسے:

دوگنا، دوبارہ، دوآبہ، دوشاخہ، دوآتشہ، دوبالا، دوراہا، دوچار، دوپٹا، دوپہر، دورنگا، دوسختا، دوگانہ

کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جن میں واو نہیں بولا جاتا۔ ان کا املا بغیر واو کے رائج ہے اور انھیں پیش ہی سے لکھنا صحیح ہے:

دُگنا، دُلائی (دوہر)، دُگانا، (سہیلی)

۷:- واو معدولہ:

کچھ لفظوں میں واو لکھا جاتا ہے مگر پڑھنے میں نہیں آتا، اس واو کو ''واو معدولہ'' کہتے ہیں۔ جیسے:

خوش، خوشی، خواب، خواجہ، خوار، درخواست، خواہش،

خواہ مخواہ، تنخواہ، خوان، خوانچہ، خواندہ، خورد برد، خوراک، برخوردار، خود، خودی، خوددار، خودکشی، خوشنود، خوش نما، خوشامد، خورشید، خواہر، خویش، کم خواب (ایک کپڑا)

خورشید اور کم خواب ان دونوں لفظوں کو بغیر واو کے "خرشید" اور "کمخاب" بھی لکھا جاتا ہے، لیکن اب ان کا ایک املا اختیار کرنا چاہیے اور ان کو واو کے ساتھ ہی (خورشید، کم خواب) لکھنا چاہیے۔

کچھ لفظوں میں واو معدولہ موجود نہیں، مگر غلطی سے لکھ دیا جاتا ہے جیسے ایک لفظ ہے "خرد" اس کے معنی ہیں: چھوٹا۔ یہ بزرگ کی ضد ہے۔ "خرد و کلاں" (بمعنی چھوٹا بڑا) عام طور پر بولا اور لکھا جاتا ہے۔ اسے واو کے ساتھ "خورد" لکھنا غلط ہے۔ کیوں کہ واو کے ساتھ "خورد" ایک الگ لفظ ہے "خوردن" مصدر سے، اس کے معنی ہیں: کھانا، غذا۔ ایسے خاص خاص لفظ یہ ہیں:

خردہ (ریزہ، ٹکڑا، ریزگاری، عیب) جیسے: خردہ فروش، خردہ گیر (عیب نکالنے والا) روپیہ خردہ کرانا،

خرد، خرد و کلاں، خردسال، خردی و بزرگی،

الف اور ہائے مختفی

ہائے مختفی[1] ہمیشہ لفظ کے آخر میں آتی ہے، یہ فارسی اور عربی لفظوں کے ساتھ خاص ہے۔ جیسے: رفتہ، آموختہ، شگفتہ، مسئلہ، تجربہ، کعبہ وغیرہ۔

جو الفاظ فارسی اور عربی کے نہیں ان کے آخر میں عام طور پر "الف" آتا ہے۔ جیسے:

بھروسا، بھوسا، گملا، پتا، بتاشا، بنگلا وغیرہ۔

مگر جن الفاظ کا املا "ہ" سے رائج ہے انھیں "ہ" سے باقی رکھا جائے۔ جیسے کمرہ، روپیہ۔

---

[1] وہ "ہ" جو لفظ کے آخر میں آتی ہے اور آواز کے لحاظ سے الف کا کام کرتی ہے۔

☆ الف اور ہائے مختفی کا قاعدہ تو یہی ہے لیکن یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ قاعدوں میں کچھ لچک ضرور ہوتی ہے اور یہ بھی ایک قاعدہ ہے، جسے قواعد کی زبان میں ''استثنا'' کہتے ہیں۔ استثنا کا مطلب یہ ہے کہ قاعدہ تو وہی رہے گا جو بیان کیا گیا ہاں! چند الفاظ ایسے ہیں جن میں وہ قاعدہ جاری نہ ہوگا۔ یہاں استثنا کے تحت سب سے پہلے شہروں کے نام آتے ہیں، جیسے آگرہ، امروہہ، لدھیانہ، پٹنہ، پٹیالہ، کلکتہ، ہوڑہ، آرہ وغیرہ۔ یہ عربی یا فارسی کے الفاظ نہیں ہیں مگر ان کو ''ہ'' کے ساتھ ہی لکھا جائے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اسی رسم الخط کے ساتھ خاص نام ہیں۔ اس لیے ان کا املا ''الف'' کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔

ہاں! جو نام کم معروف یا غیر معروف ہیں ان کے آخر میں ''الف'' لکھا جائے گا۔ جیسے گنگر سنڈا، اٹورا، سدھونا، اِنہونا وغیرہ۔

☆ بہت سے ایسے مفرد الفاظ جو اصل کے لحاظ سے تو عربی یا فارسی کے ہیں لیکن اردو میں آ کر ان کی شکل اس طرح بدل گئی گویا کہ یہ اصلاً اسی زبان کے الفاظ ہیں۔ ایسے الفاظ کے آخر میں بھی الف لکھنا چاہیے۔ جیسے:

بسترا ، پُرسا ، رنجا ، غبّارا ، مسالا ، بدلا وغیرہ

☆ بہت سے مرکب الفاظ ایسے ہیں جن کا ایک ٹکڑا عربی یا فارسی کا ہے یا ایسے الفاظ جن کے دونوں ٹکڑے عربی یا فارسی کے ہیں۔ لیکن اردو میں آ کر ان میں ایسی تبدیلی آ گئی کہ ان میں مکمل اردو پن آ گیا تو ایسے لفظوں کے آخر میں الف لکھنا چاہیے۔

جیسے: ادلا بدلا، بے اصولا، بے صبرا، بے فکرا، چوراہا، چوطرفا، دورخا، نمک پارا، ناشکرا، وغیرہ۔

☆ اردو والے عربی اور فارسی کے اتباع میں اردو الفاظ میں بھی ہائے مختفی لکھنے لگے ہیں، ایسے تمام دیسی الفاظ جو ''ہ'' سے لکھے جاتے ہیں انہیں ''الف'' سے لکھنا چاہیے۔ جیسے:

بھروسا　　اڈّا　　ٹھیکا　　بھوسا　　آرا　　راجا

آنولا	دھوکا	ڈھانچا	اکھاڑا	انگارا	انگرکھا
بتاشا	بٹوا	بیڑا	باجا	بلبلا	بنجارا
پانسا	پٹاخا	پٹارا	پیڑا	پھاوڑا	پھیپھڑا
تگوڑا	توبڑا	جالا	ٹھپّا	ٹڈا	پھندا
ہنڈولا	کٹورا	چبوترا	چٹخارا	دھندا	رجواڑا
چٹکلا	موگرا	دسہرا	ڈبیا	خراٹا	سانچا
سہرا	کھاجا	کیوڑا	گھونسلا		

دانا، دانہ

ذیل کے پہلے کالم کے تحت درج ہر لفظ میں آخری حرف الف ہے اور دوسرے میں ہائے مختفی۔ یہ الگ الگ لفظ ہیں اور ان کے الگ الگ معنی ہیں۔ چناں چہ ان کے املا کا تعین ان کے معنی سے ہوگا:

دانا (جاننے والا، عقل مند)	:	دانہ (بیج، مال، دانۂ گندم)
چارا (مویشیوں کی خوراک)	:	چارہ (علاج، مدد، چھٹکارا)
خاصا (اضافے کے معنی میں، جیسے: اچھا خاصا)	:	خاصّہ (طبیعت، عادت)
پارا (سیماب)	:	پارہ (ٹکڑا، حصہ)
لالا (لقب)	:	لالہ (ایک قسم کا پھول)
نالا (بڑی نالی)	:	نالہ (فریاد)
پتّا (درخت کا پتا)	:	پتہ (نشان، مقام)
نا (کلمۂ نفی برائے ترکیب، جیسے نامعلوم)	:	نہ (مخفف کلمۂ نفی)
آنا (مصدر)	:	آنہ (پرانے روپے کا سولھواں حصہ)

ہائے مختفی والے الفاظ کی محرف شکلیں

جب ہائے مختفی والے الفاظ (پردہ، عرصہ، جلوہ، قصّہ) محرف ہوتے ہیں تو تلفظ میں آخری آواز ''یائے مجہول'' ادا ہوتی ہے۔ املا میں بھی تلفظ کی

پیروی ضروری ہے۔ چناں چہ ایسے تمام الفاظ کی محرّف شکلوں میں ''ے'' (یائے مجہول) لکھنی چاہیے۔

بندے (کا)	پردے (پر)	عرصے (سے)
جلوے (کی)	مےخانے (تک)	افسانے (میں)
غصّے (میں)	مدرسے (سے)	مرثیے (کے)

ہائے مختفی کا غلط استعمال

کچھ الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی لکھ دی جاتی ہے۔ جیسے: موقعہ، معہ، مصرعہ وغیرہ۔ یہاں ہائے مختفی کا اضافہ بالکل غلط ہے۔ ان کا صحیح املا یوں ہے۔

موقع مع مصرع موضع مرقع مرصع

یوں ہی ''مع'' کو بمع یا بمعہ بھی لکھتے ہیں، یہ بھی غلط ہے۔

سنہ، سن

''سنہ'' بمعنی سال کو اکثر بغیر ''ہ'' کے ''سن'' لکھا جاتا ہے جو غلط ہے۔ یہ دو الگ الگ لفظ ہیں ''سنہ'' بمعنی سال ہائے خفی سے ہے جیسے: سنہ ۱۸۵۷ء، یا سنہ ہجری یا سنہ عیسوی۔ اور ''سَن'' فتحہ کے ساتھ بغیر ہا کے ہندی لفظ ہے اس کے معنی ایک قسم کے پودے کے ہیں جس کی چھال سے رسیاں بنتی ہیں اور سین کے کسرے کے ساتھ عربی ہے جس کا معنی ''عمر'' اور ''دانت'' کے ہیں۔ جب سنہ کے ساتھ اعداد بھی لکھے جائیں جیسے سنہ ۲۰۰۸ء تب اس پر نون کا نقطہ نہیں رکھا جائے گا اور بغیر اعداد کے لکھے جائیں تو نقطہ لکھا جائے گا۔ جیسے:

انقلاب سنہ ستاون میں بہت سے علما شہید کیے گئے۔

سنہ پر ''ھ'' ہجری کی علامت ہوتی ہے اور ''ء'' عین کا سرا عیسوی کی علامت۔

ہائے ملفوظ اور غیر ملفوظ کے املا میں فرق

لفظ کے آخر میں آنے والی ''ہ'' کبھی ملفوظ ہوتی ہے یعنی اپنی آواز دیتی ہے اور کبھی خفی غیر ملفوظ ہوتی ہے یعنی وہ اپنی آواز نہیں دیتی۔ اگر ان دونوں کے درمیان فرق ظاہر کرنا مقصود ہو تو ہائے ملفوظ کے نیچے لٹکن لگایا جا سکتا ہے ورنہ اس کی ضرورت نہیں۔ جیسے:

بہنا مصدر سے بہ۔ سہنا مصدر سے سہ۔ کہنا مصدر سے کہ۔ تہ بہ تہ
کہ، یہ

''کہ'' (کاف بیانیہ) اور ''یہ'' میں ''ہ'' کی آواز عموماً نہیں ہوتی یا بہت کمزور ادا ہوتی ہے۔ ان کو ''ہ'' کی لٹکن کے بغیر لکھنا چاہیے۔

ہائے مخلوط اور غیر مخلوط کے املا میں فرق

جب ''ہ'' کو اس کی مستقل اور منفرد آواز کے ساتھ پڑھا جائے تو اسے ہائے مستقل یا ہائے غیر مخلوط کہتے ہیں، جیسے: چہل پہل، شہر، جہان، ہم، ہال وغیرہ۔ اور اگر اس کے پہلے لگے ہوئے کسی حرف کے ساتھ ملا کر دونوں کی مخلوط آواز نکالی جائے تو اسے ہائے مخلوط کہتے ہیں، جیسے: چھلا، پھل، جھروکا وغیرہ[1]۔

اتنی وضاحت کے بعد ان کے املا کا یہ ضابطہ ذہن نشین کر لینا چاہیے:

ہائے مستقل کو کبھی بھی دوچشمی ہا سے نہیں لکھا جائے گا بلکہ لٹکن والی ہا سے لکھا جائے گا جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے واضح ہے اور ہائے مخلوط کو ہمیشہ دوچشمی ہا سے ہی لکھا جائے گا، جیسے:

---

[1] ب پ ت ٹ ج چ ڈ ڈ ڑ ک گ ل م ن ۔ ہا کے ساتھ مخلوط ہونے والے حروف۔
ا ث ح خ ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق و۔ ہا کے ساتھ مخلوط نہ ہونے والے حروف۔

بھول	پھول	تھوک	ٹھوکر	جھرنا
اچھلنا	اودھ	ڈھکن	ڈھالنا	پڑھنا
آنکھ	ماگھ	دولھا	کمھار	ننھا

ہی کلمۂ حصر کا استعمال

ہی کلمۂ حصر ہے جیسے: میں آج ہی آیا اور کل ہی جاؤں گا۔

بعض الفاظ سے ملنے کے بعد اس کی صورت میں کچھ تبدیلی آتی ہے، کہیں ہ حذف ہو جاتی ہے، کہیں نون غنہ کا اضافہ ہو جاتا ہے، کہیں دونوں باتیں جمع ہو جاتی ہیں جیسے وہی (وہ + ہی) آیا۔ تمھیں (تم ہی) دیکھو۔ ہمیں (ہم ہی) سنیں گے۔

ذیل میں ایسے الفاظ کا ایک نقشہ اصلی، استعمالی، ترجیحی اور جائز صورتوں کے ساتھ دیا جاتا ہے:

لفظ	ہی سے مل کر اصلی صورت	استعمالی صورت	ترجیحی صورت	جائز صورت
میں	میں ہی	میں ہی۔	میں ہی	
ہم	ہم ہی	ہم ہی۔ ہمیں	ہمیں	
یوں	یوں ہی	یوں ہی۔ یونہیں	یوں ہی	
جوں	جوں ہی	جوں ہی	جوں ہی	
تو	تو ہی	تو ہی	تو ہی	
اِن	اِن ہی	ان ہی۔ انہی۔ انھی۔ انھیں	انھی	انھیں۔ انہی

اُن	اُن ہی	اُن ہی۔ اُنہی۔ اُنھی۔ اُنھیں	اُنھی	اُنھیں۔ اُنہی
تم	تم ہی	تم ہی۔ تمھی۔ تمھی۔ تمھیں	تمھی	تمھیں
تب	تب ہی	تب ہی۔ تبھی	تبھی	
اب	اب ہی	اب ہی۔ ابھی	ابھی	
کب	کب ہی	کب ہی۔ کبھی	کبھی	
جب	جب ہی	جب ہی۔ جبھی	جبھی	
سب	سب ہی	سب ہی۔ سبھی	سبھی	
مجھ	مجھ ہی	مجھی	مجھی	
تجھ	تجھ ہی	تجھی	تجھی	
وہ	وہ ہی	وہی	وہی	
یہ	یہ ہی	یہی	یہی	
وہاں	وہاں ہی	وہیں	وہیں	
یہاں	جہاں ہی	یہیں	یہیں	
اِس	اِس ہی	اِسی	اِسی	
اُس	اُس ہی	اُسی	اُسی	
آپ	آپ ہی	آپ ہی۔ آپی	آپ ہی	آپی
ایک	ایک ہی	ایک ہی۔ ایکی	ایک ہی	ایکی

ترجیحی صورت کا مطلب یہ ہے کہ اب اسی کو اختیار کرنا چاہیے اور جائز صورت کا مطلب یہ کہ سابقہ کثرتِ استعمال کا لحاظ کرتے ہوئے اسے اپنانا بھی روا ہے۔

بھابھی، بھابی

اردو میں وہ الفاظ جن میں دو ہائے مخلوط آتی ہیں، دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو کسی نہ کسی طرح کی کیفیت ظاہر کرتے ہیں، جیسے: بھن بھناہٹ، چھن چھناہٹ، تھرتھراہٹ، جھل جھلاہٹ۔ یہ صوتی الفاظ ہیں، ان میں اجزا کی تکراری نوعیت چوں کہ کوئی نہ کوئی حسّی کیفیت ظاہر کرتی ہے، اس لیے ایسے الفاظ میں دونوں ہائے مخلوط (ہکاریت) جزوِ اصلی کی حیثیت رکھتی ہیں، اور ان کو جوں کا توں لکھنا چاہیے:

جھن جھناہٹ:	جھن جھنانا	تھرتھراہٹ:	تھرتھرانا
کھڑکھڑاہٹ:	کھڑکھڑانا	بھن بھناہٹ:	بھن بھنانا
چھن چھناہٹ:	چھن چھنانا	کھٹ کھٹاہٹ:	کھٹ کھٹانا

لیکن بعض مفرد الفاظ میں دوسری ہائے مخلوط زائل ہو جاتی ہے، جیسے بھابھی سے بھابی۔ ایسے الفاظ کو صرف پہلی ایک ھ سے لکھنا مرجح ہے، فرہنگ آصفیہ اور دیگر لغات نے اسی کو اختیار کیا ہے: اس طرح کے کچھ الفاظ ذیل میں لکھے جاتے ہیں:

بھابی	بھبوکا	ڈھیٹ	بھبکی	بھبک
بھنبوڑنا	گھونگا	گھنگرو		

ھے، ہے

بعض لوگ لفظ کے وسط یا شروع میں ہائے غیر مخلوط کو لٹکن والی ہ کے بجائے دو چشمی ہا (ھ) سے لکھتے ہیں، یہ املا غلط ہے۔

اس سلسلے میں یہ صریح قاعدہ مدنظر رہنا چاہیے کہ صرف ہائے مخلوط کو ہی دو چشمی ہا سے لکھیں گے باقی (ہا) کو خواہ کہیں بھی ہو لٹکن والی ہا سے لکھیں گے اور لفظ کے شروع

کی ہا تو ہمیشہ لٹکن والی ہا سے ہی لکھی جائے گی اس کا مخلوط ہونا ممکن ہی نہیں ہے کیوں کہ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس سے پہلے کوئی حرف متصل ہو جس سے وہ مخلوط ہو سکے۔ کچھ الفاظ غلط اور صحیح کی نشان دہی کے ساتھ ذیل میں لکھے جاتے ہیں:

غلط	صحیح	غلط	صحیح
ھے	ہے	ھوا	ہوا
ھندوستان	ہندوستان	دھلی	دہلی
ھمیشه	ہمیشہ	کھاں	کہاں
نھال	نہال	باھر	باہر

تجھ کو، مجھ کو

یہ در حقیقت ''تو'' اور ''میں'' ضمیر کی حالت مفعولی میں محرف شکلیں ہیں اس کی دوسری شکل آخر میں ''کو'' کی بجائے یائے مجہول (ے) کے ساتھ ''تجھے'' اور ''مجھے'' بھی ہے۔ ان میں (ج) کے بعد ہائے مخلوط بھی ہے لہذا ان کا املا ہائے مجہول کے ساتھ ہی صحیح ہے بغیر اس کے صرف (ج) سے تجے، مجے، تجکو، مجکو لکھنا درست نہیں۔

ہمزہ

ا۔ ہمزہ اور الف

عربی کے متعدد مصادر، جمعوں اور مفرد الفاظ کے آخر میں الف یا واو کے بعد اصلاً ہمزہ ہے، جیسے:

ابتداء انتہاء املاء انشاء شُعَراء

حکماء سوء ضیاء صَحْراء خَضْراء

اردو میں ان الفاظ کا ہمزہ تلفظ میں نہیں آتا، اس لیے انھیں ہمزہ کے بغیر لکھنا چاہیے:

ابتدا انتہا املا انشا شعرا سو ضیا صحرا خضرا

ہاں! ایسا لفظ اگر کسی عربی ترکیب کا حصہ ہو تو ہمزہ کے ساتھ جوں کا توں لکھا

جائے گا۔ جیسے:

ان شاءاللّٰہ	ضیاءالرحمٰن	ذکاءُاللّٰہ	ثناءُالحق
بہاءاللّٰہ	ضیاءُالدین	علاءالدین	ثناءُاللّٰہ

یہاں بعض حضرات ہمزہ واو کے اوپر بناتے ہیں اور یوں لکھتے ہیں "بہاؤاللّٰہ" یہ املا عربی میں (مضموم ہمزہ کے لیے) ہے، اردو میں نہیں۔ فارسی ترکیب اضافی اور ترکیب توصیفی کی صورت میں ان کے آگے صرف یا مجہول "ے" بڑھادی جائے گی۔ جیسے:

ابتدائے سال	انتہائے شوق	املائے فارسی	انشائے عربی
شعرائے ہند	سوئے ادب	ضیائے خورشید	صحرائے افریقہ
علمائے کرام	قرّائے عظام	اطبائے حاذق۔	حکمائے ہند

۲- جُرأت ، تأثُّر

لفظ کے درمیان میں جب الف مفتوح ہوگا تو اس پر صرف زبر آئے گا، ہمزہ نہیں لکھا جائے گا، جیسے:

تاَمل، تاَخر، توَام، جراَت، تاَسّف، متاَثّر، متاَخّر، متاَسّف، تاَثّرات۔

بعض حضرات ایسے الفاظ پر ہمزہ بناتے ہیں اور یہ بھی رواج میں ہے، اس لیے اسے غلط نہ سمجھا جائے۔ ہاں! زبر اور ہمزہ کچھ بھی نہ ہو تو کم خواندہ لوگ تلفظ میں غلطی کا شکار ہو سکتے ہیں یعنی ایسے الفاظ کو الف ساکن سے ادا کرنے کی غلطی میں پڑ سکتے ہیں۔ اس لیے کم از کم ابتدائی کتابوں میں ایسے الفاظ پر زبر لکھنے کی پابندی مناسب ہے۔

۳- مورِّخ، موثّر

عربی کے کچھ الفاظ ایسے ہیں جن میں ہمزۂ مفتوحہ سے پہلے کوئی حرف مضموم ہوتا ہے تو عربی میں ایسے تمام الفاظ کو واو پر ہمزہ لگا کر لکھتے ہیں جیسے مؤنث، مؤثر، مؤرخ وغیرہ۔ ان کا تلفظ تو ہمزہ سے ہوتا ہے مگر عربی قاعدۂ املا کے باعث کتابت میں واو بھی آتا ہے۔ ایسے الفاظ کی صورت اگر تلفظ کے مطابق ہو تو "مُأنّث ، مُأدّب ، مُأثّر"

لکھنا پڑے گا۔ عربی کی طرح اردو میں بھی یہ صورت رواج کے بالکل خلاف اور سخت نامانوس ہوگی۔ اس لیے ایسے الفاظ میں واو پر ہمزہ بنانا، درست ہے تا کہ صحیح تلفظ کی جانب رہ نمائی ہو سکے۔ ہمزہ نہ بنائیں تو یہ ایک طرح کی آسانی تو ہوگی مگر بعض قارئین ان کے تلفظ میں الجھن کا شکار ہو سکتے ہیں۔ ایسے کچھ الفاظ یہ ہیں:

مؤرّخ، مؤنّث، مؤثّر، مؤدّب، مؤسّس، مؤکّد،
مؤلّف، مؤیّد، مؤذّن، مؤرّخہ

۴۔ قراءت، براءت

قراءت: عربی لفظ ہے اسے عام طور پر قرءت، قرّت اور قرات بولا اور لکھا جاتا ہے۔ یہ تلفظ اور املا دونوں غلط ہیں، صحیح املا اور تلفظ "قراءت" ہے یعنی پہلے الف اس کے بعد ہمزہ مفتوحہ۔ ایسے ہی براءت دناءت وغیرہ کو بھی لکھنا اور پڑھنا چاہیے۔

☆ انگریزی وغیرہ کے ایسے الفاظ جن میں الف اور واو متحرک یک جا ہیں، ان میں واو پر ہمزہ لکھنا مناسب ہے۔ جیسے:

اناؤنسر، اکاؤنٹ، اکاؤنٹنٹ، پاؤنڈ، پاؤڈر، ساؤتھ،
الاؤنس، گراؤنڈ، ساؤنڈ، کمپاؤنڈ، ٹاؤن ہال، راؤنڈ،

دراصل ان کے تلفظ میں واو کی جگہ الف آتا ہے مگر الف کے متصل الف لکھنے سے ایک نامانوس صورت پیدا ہوتی ہے۔ انااُنسر - الااُنس - پااُنڈ - وغیرہ، اس لیے ان الفاظ کا املا الف کے بعد "واؤ" سے اختیار کیا گیا۔ تلفظ کی جانب رہ نمائی کے لیے واو پر ہمزہ بنانا مفید اور اچھا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان الفاظ کے بولنے میں نہ خالص واوِ مضموم ادا ہوتا ہے نہ صاف الف مضموم۔ بلکہ ایک ملی جلی کیفیت ہوتی ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ نہ خالص واو لکھا جائے نہ خالص ہمزہ یا الف۔ بلکہ ملی جلی کیفیت کا اظہار کیا جائے۔ عرض ہے کہ اس اظہار کے لیے بھی واو پر ہمزہ مناسب ہے۔

ہمزہ اور واو

۱:- لفظ کے آخر میں اگر واو ساکن ہو تو اس پر ہمزہ کبھی نہیں آئے گا، جیسے:

برتاو، باو، (ہوا) باو گولا، الاو، اوذ بلاو،
بھاو، پاو (جیسے: پاو سیر) پلاو، تاو، چاو،
راو، (راو صاحب یا رگھونت راو) ستھراو، ناو، کڑھاو،
گاو (گائے) گھاو، واو، پچھیاو، ہواو، پتھراو،
دریاو، سبھاو، تلاو

۲:- بہت سے حاصل مصدر بھی ایسے ہیں جن کے آخر میں واو آتا ہے جیسے: دبانا سے دباو، چڑھانا سے چڑھاو اور گھمانا سے گھماو۔ ان میں بھی واو ساکن ہے، اور اس سے پہلے الف ہے، یہاں بھی ہمزہ نہیں آئے گا۔ ہمزہ لکھنے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ الف اور واو کے بیچ میں ایک اور حرف (ہمزہ) بھی ہے، جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں۔ نیز او پر ہمزہ لکھنے کی صورت میں ان میں بہت سے حاصل مصدر فعل امر ہو جائیں گے۔
ایسے کچھ حاصل مصدر یہ ہیں:

الجھاو، اٹکاو، بناو، بہاو، بچاو، بھراو،
بہکاو، پٹاو، تناو، ٹکراو، ٹھہراو، جھکاو،
جماو، چڑھاو، نبھاو چھڑکاو، چناو، کٹاو،
دباو، لگاو، ڈھلاو، رکاو، کساو گھٹاو،
لداو، گھماو، پھراو، گراو، گھراو۔

جیسے: یہ لداو کی چھت ہے۔ اتنا گھماو پھراو اچھا نہیں ہوتا۔ طوفان میں ٹھہراو آ گیا ہے۔ ان کا جھکاو اس طرف ہے۔ کوٹ میں بھراو اچھا نہیں پڑا۔ سب نے بیچ بچاو کر دیا۔ دریا چڑھاو پر ہے۔ سڑک پر خوب چھڑکاو ہوا۔ ؎

لاکھوں لگاو، ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناو، ایک بگڑنا عتاب میں۔

ان الفاظ میں دوہرے حرف کی آواز نہیں آتی، لیکن بعض حضرات کا خیال ہے کہ دوہری آواز ہوتی ہے، اس لیے "و" کے اوپر ہمزہ لکھنا چاہیے۔
آؤ، جاؤ، کھاؤ، لاؤ، اِتراؤ، الجھاؤ، بچاؤ، چڑھاؤ، ٹھہراؤ، لگاؤ۔

ان میں سے پہلے پانچ الفاظ محض فعل امر ہیں اور اخیر کے پانچ حاصل مصدر کا بھی احتمال رکھتے ہیں اس لیے اول پانچ کو ہمزہ کے ساتھ اور باقی پانچ کو حاصل مصدر کی صورت میں بغیر ہمزہ کے اور امر کی صورت میں ہمزہ کے ساتھ لکھیں گے۔ جیسے تم تو اپنا رنگ جماؤ، اس جملے میں "جماؤ" فعل ہے۔ اور آج تو وہاں بڑا جماو ہے۔ اس میں "جماو" حاصل مصدر ہے۔ اسی طرح مثلاً: مجھ کو میرے دشمنوں سے بچاؤ، اس جملے میں "بچاؤ" فعل ہے، اور اپنا بچاو خود کرو۔ اس میں "بچاو" حاصل مصدر ہے۔ اس فرق پر نظر رکھنی چاہیے۔

اسی طرح اس قسم کے جتنے اسم فاعل (اور کچھ اسم مفعول) ہیں، ان میں بھی واو پر ہمزہ آتا ہے۔ حاصل مصدر اور اسم فاعل میں ایک فرق یہ بھی ہوتا ہے کہ حاصل مصدر میں واو کی آواز مجہول سی ہوتی ہے اور اسم فاعل میں واو معروف ہوتا ہے۔ جیسے: "بناو" حاصل مصدر ہے، اور اس جملے میں کہ "وہ بناؤ نہیں، بگاڑو ہیں"؛ "بناؤ" اور "بگاڑو" اسم فاعل ہیں۔ ایسے کچھ اسم فاعل اور اسم مفعول یہ ہیں:

بناؤ، جتاؤ، کماؤ، لٹاؤ، جڑاؤ، پیاؤ، ڈباؤ، ٹکاؤ، بکاؤ۔

وہ تو کماؤ پوت ہے۔ پانی، ہاتھی ڈباؤ ہے۔ یہ بہت اچھا اور ٹکاؤ جوتا ہے۔ جڑاؤ زیور خوبصورت ہوتے ہیں۔ یہ مال بکاؤ نہیں۔ وہ تو اٹھاؤ چولھا ہے۔ پیاؤ پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ وہ تو بڑے لٹاؤ ہیں، سب اڑا دیں گے۔

ہمزہ اور "ی" (یاے معروف)

لفظ میں یاے مجہول سے پہلے کبھی "ی" آتی ہے، جیسے: دیے، لیے، پیے وغیرہ اور کبھی ہمزہ آتا ہے، جیسے: گئے، لائے، سوئے وغیرہ۔

اس سلسلے میں قاعدہ یہ ہے:

(۱) جب "ی" سے پہلے والے حرف پر زیر ہو تو وہاں دو "ی" آئیں گی۔ جیسے: لکھیے (لکھ ی ے) پڑھیے (پڑھ ی ے) کیے (ک ی ے)

(۲) ہمزہ اس صورت میں آئے گا جب ''ی'' سے پہلے والے حرف پر زبر یا الف یا واو ساکن ہو، جیسے: گیئے، سنئے، آئے، جائے، نہائے، سوئے، روئے، دھوئے۔

ہمزہ اور ''ے'' (یائے مجہول)

جن لفظوں کے آخر میں ''ے'' ساکن ہو اور اس سے پہلے الف یا واو ہو تو اس پر ہمزہ نہیں آئے گا۔ جیسے: ''گائے''، اگر اسے ''گائے'' لکھا جائے تو لفظ ہی بدل جائے گا اور یہ گانا مصدر کا فعل ہو جائے گا، جیسے: اس سے کہو وہ گانا گائے۔ ذیل کے الفاظ سے فرق معلوم کیجیے:

گاے	(اسم)	گائے	(فعل، گانا مصدر سے)
پاے	(اسم)	پائے	(فعل، پانا مصدر سے)
جاے	(اسم)	جائے	(فعل، جانا مصدر سے)

ذیل کے لفظوں کو بھی بغیر ہمزہ کے لکھنا چاہیے:

راے، ہاے، چاے، واے، براے، سواے، بجاے، سہاے، سراے، وائسراے، آبناے، اُپاے، ناے، وغیرہ

ترکیب کے ساتھ چند مثالیں: چاے ٹھنڈی ہے۔ گاے کا سر۔ زید کی بجاے ذاکر آیا۔ ان کی راے درست ہے۔ موہن سَہاے روانہ ہوے۔

☆ جن لفظوں کے آخر میں ''ے'' ہو اس سے پہلے والے حرف پر اگر زبر ہو تو ایسے الفاظ بغیر ہمزہ کے لکھے جائیں گے، جیسے:

مَے، نَے، شَے، پَے، درپَے، قَے، جَے، طَے، رَے، وغیرہ۔

آزمائش، نمائش

فارسی میں حاصل مصدر کبھی فعل امر سے بنتا ہے جیسے کوشیدن سے ''کوش'' امر، ''کوشش'' حاصل مصدر۔ آفریدن سے ''آفریں'' امر، آفرینش حاصل مصدر۔ بعض

مصادر کا امر آخر میں یا کے ساتھ ہوتا ہے اس ''پر ش'' بڑھا کر حاصل مصدر بناتے ہیں جیسے آزمودن سے امر'' آزمائے'' حاصل مصدر'' آزمایش'' فارسی میں اس طرح کے الفاظ کو''ش'' سے پہلے یا کے ساتھ لکھتے ہیں۔لیکن اردو میں ایسے مصادر''ش'' سے قبل ہمزہ کے ساتھ بولے اور لکھے جاتے ہیں اس لیے اردو میں ان کو ہمزہ ہی سے لکھنا صحیح ہے اور چلن بھی یہی ہے۔ اردو میں ان کے تلفظ میں''ی'' کی آواز کا شائبہ تک نہیں ہوتا اس لیے یہاں ان کو''ی'' سے لکھنے پر اصرار کرنا محض فارسی کی نقالی ہے۔جیسے:

آزمائش، نمائش، آسائش، ستائش، آرائش، آلائش، پیمائش۔

اسی طرح ذیل کے الفاظ کا املا بھی ہمزہ سے راجح ہے:

آئندہ، نمائندہ، پائندہ، نمائندگی، سائل، شائع، شائق، قائم، مائل وغیرہ۔اِن کو''ی'' سے لکھنا غلط ہے۔ان کا صحیح املا ہمزہ ہی سے ہے۔

اضافت

اضافت کا آسان طریقہ یہ ہے کہ مضاف کے آخری حرف پر اضافت کا زیر ہو۔ جیسے ایک لفظ ہے''سکون''اس کا آخری حرف''ن'' ہے تو اضافت کی صورت میں''ن'' پر زیر دے کر مثلاً''سکونِ دل'' پڑھیں گے ایسے لفظوں کے املا میں کوئی اختلاف نہیں۔

بعض صورتوں میں اہل زبان و املا کا اختلاف ہے، ان کی تفصیل اپنی ترجیحی صورت کے ساتھ ہم آگے ذکر کر رہے ہیں۔

اول:۔ فارسی ترکیب کے مضاف یا موصوف کے آخر میں''ی'' ہو، مثلاً: بندگی، زندگی، آزادی۔

اس میں اختلافی صورتیں: (۱) بندگیِ خدا (ی پر کسرہ کے ساتھ) (۲) بندگیٔ خدا (ی پر ہمزۂ مکسور بڑھا کر)

ترجیحی صورت: ہمارے نزدیک اول ہے، یعنی بندگیِ خدا، آزادیِ نسواں (ی پر صرف کسرہ دے کر) اس لیے کہ ترکیب اضافی یا توصیفی، مضاف یا موصوف پر صرف

کسرہ چاہتی ہے اور "ی" کسرہ قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو ہمزہ بڑھانے کی ضرورت نہیں، "ی" پر کسرہ دینا کافی ہے۔

دوم:۔ آخر میں الف کے بعد "ے" ہو، جیسے: سرائے، رائے۔

اختلافی صورتیں:۔ (۱) سرائے فانی (صرف "ے" کے ساتھ) (۲) سرائۓ فانی ("ے" پر ہمزہ کے اضافے کے ساتھ)

سوم:۔ آخر میں صرف الف ہو، جیسے: دنیا، مدعا، تمنا، تقاضا، تماشا، مبتلا وغیرہ۔

اختلافی صورتیں:۔ (۱) دنیائے عمل، مدعائے تحریر، (صرف "ے" کے اضافے کے ساتھ) (۲) تمنائۓ دل، تقاضائۓ وقت ("ے" پر ہمزہ بڑھا کر)

چہارم:۔ الف کے بعد اصل میں ہمزہ ہو جو فارسی اور اردو تلفظ و کتابت میں بالکل ساقط ہوتا ہے، جیسے: دعا، ندا، جزا، انشا، اعتنا، انتفا، حکما، علما، شرفا، شرکا، اولیا، اصفیا، انبیا وغیرہ۔

اختلافی صورتیں:	(۱)	جزاءِ عمل	(ہمزۂ مکسور کے ساتھ)
	(۲)	جزائۓ عمل	("ے" پر ہمزہ کے ساتھ)
	(۳)	جزائے عمل	(صرف "ے" کے ساتھ)

دوم تا چہارم میں ترجیحی صورت: اشعار میں اضافت کا اظہار کبھی بہت ہلکا ہوتا ہے اور کبھی ذرا طول دے کر ہوتا ہے، اسی لیے کسرۂ اضافت کی جگہ کہیں پورا ایک حرف تقطیع میں آتا ہے اور کہیں نہیں آتا، کچھ ایسا ہی معاملہ "ے" کے ساتھ لکھے جانے والے الفاظ میں بھی پایا جاتا ہے، کہیں اس "ے" کی جگہ ایک حرف شمار ہوتا ہے، کہیں دو حرف۔ ذیل کی مثالیں دیکھیں:

ایک حرف شمار ہونے والی مثال:

(۱) قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم
(۲) منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم　　(اقبال)

(۴) ملتیں جب مٹ گئیں اجزاے ایماں ہو گئیں (غالبؔ)

دو حرف شمار ہونے کی مثال:

(۱) مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ

یہاں تقطیع میں "مبتلا اِے درد کوئی" ہو رہا ہے۔

(۲) زہے عزت و اعتلائے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

(۳) کہ ہے عرش حق زیر پائے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

ان دونوں مصرعوں میں بھی حسب بالا دو حرف "اِے" شمار میں آتے ہیں۔

ایسی جگہ ہمارے خیال میں "ے" پر ہمزہ لگانا ضروری ہے اور جہاں صرف ایک حرف شمار میں آئے وہاں صرف "ے" پر اکتفا ہونا چاہیے تاکہ دونوں کا فرق ظاہر ہو سکے۔

مگر نثر میں صرف ایک صورت "ے" بغیر ہمزہ کے اختیار کی جائے تو مناسب ہے اور اگر کوئی "ئے" پر ہمزہ لاتا ہے تو اسے بھی غلط نہیں سمجھنا چاہیے[۱]۔

☆ عربی کے بعض الفاظ کے آخر میں "ی" لکھی جاتی ہے مگر پڑھنے میں "الف" آتا ہے، جیسے: دعویٰ، فتویٰ، تقویٰ، لیلیٰ وغیرہ۔

اس طرح کے الفاظ میں اضافت ظاہر کرنے کی دو صورتیں نظم میں رائج ہیں۔

(۱) الف اور یاے مجہول کے ساتھ۔ جیسے:

مجبوری و دعواے گرفتاریِ الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے (غالبؔ)

پھر پلٹ کر منہ نہ اس جانب کیا
سچ ہے اور دعواے الفت کیجیے (رضا بریلوی)

---

[۱] یہ پوری بحث ایک نشست میں استاذ گرامی مولانا محمد احمد مصباحی کی بیان کردہ تحقیق و تفصیل پر مبنی ہے۔ یہ تفصیل مجھے پسند آئی اور امید ہے کہ اہل علم بھی اس سے اتفاق کریں گے۔ فیضی۔

شوق لیلائے سِوِل سروِس نے مجھ مجنوں کو
اتنا دوڑایا، لنگوٹی کر دیا پتلون کو (اکبر الٰہ آبادی)

(۲) ''ی'' پر ہمزہ دے کر، جیسے:

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعویٰ وارستگی کی شرم (غالبؔ)

ان کے آگے دعوئ ہستی رضا
کیا بکے جاتا ہے یہ ہر بار ہم (رضاؔ بریلوی)

لیلئ شب کھولتی ہے آ کے جب زلف رسا
دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا (اقبالؔ)

لیکن نثر میں اِن الفاظ کے اندر اضافت کا اظہار الف اور یائے مجہول سے ہوگا۔ چوں کہ اس طرح کے الفاظ کی ملفوظی صورت ''الف'' ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے الفاظ کو ان لفظوں کی طرح استعمال کیا جائے گا جن کے آخر میں ''الف'' ہوتا ہے۔ جیسے: دعوائے پارسائی، فتوائے اشرفیہ، تقوائے اکابر۔

● بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن کے آخر میں ''ئی'' کا لاحقہ شامل کر کے، حاصل مصدر بناتے ہیں، جیسے: ''رعنا'' سے ''رعنائی'' اور ''زیبا'' سے ''زیبائی'' وغیرہ۔

اضافت کی صورت میں ایسے لفظوں میں بھی ''ی'' پر ہی اضافت کا زیر آجائے گا، اس پر ہمزہ کا اضافہ درست نہیں۔ جیسے: زیبائیِ چمن، رعنائیِ خیال، رسوائیِ عاشق، صفائیِ شہر، بے وفائیِ دنیا، جدائیِ معشوق، شناسائیِ چندروزہ، یکتائیِ محبوب۔

اگر ایسے لفظ کے بعد حرف عطف ''و'' کے ساتھ کوئی معطوف آئے تو بھی ''ی'' پر ''ہمزہ'' نہیں لکھا جائے گا، جیسے: زندگی و موت، جوانی و پیری، رعنائی و زیبائی، خدائی و بندگی وغیرہ۔

● کچھ الفاظ ایسے ہیں جن کے آخر میں ''ی'' موقوف ہوتی ہے، یعنی ''ی'' سے پہلے والا حرف بھی ساکن ہوتا ہے، جیسے: سَعْی، نَہْی، نَفْی۔

اضافت اور توصیف کی صورت میں اس ''ی'' پر بھی ہمزہ نہیں آئے گا بلکہ قاعدے کے مطابق صرف ''ی'' پر زیر آئے گا، جیسے: وحیِ خدا، سعیِ غیر، سعیِ پیہم۔

ع: سعیِ لا حاصل مداوائے مریض عشق ہے۔

ع: نہیِ مے خواری کرے جس دم وہ محبوبِ خدا

اور عطف کی صورت میں زیر کی بھی ضرورت نہیں بلکہ ''ی'' پر ضمہ کی بو ہوگی۔

جیسے: وحی والہام، نفی واثبات، سعی وکوشش، نہی وانکار۔

ع: وحی والہام سے بڑھ کر ہے یہاں کون سی چیز

● اشعار میں کبھی کبھی شعری ضرورت سے لفظ کے آخر کی ''ی'' مشدد بھی ہو جاتی ہے۔ جیسے: ع: سردیِ حنا پہنچے ہے عاشق کے جگر تک۔

ع: سرخیِ رنگِ رخ سے چمک اور بڑھ گئی۔

یہاں بھی ہمزہ کی گنجائش نہیں۔ یعنی اس کو ہمزہ کے ساتھ ''سردئ حنا'' لکھنا قطعاً غلط ہوگا۔ تشدید کی جگہ ہمزہ کسی بھی صورت میں نہیں آسکتا۔

● مے، نے جیسے الفاظ، جن میں ''ے'' سے پہلے والے حرف پر زبر ہوتا ہے، اضافت کی صورت میں ''ے'' پر زیر لگانے کی بات کرتے ہیں۔ جب کہ اس صورت میں تلفظ بڑا مشکل ہے، جیسے: مےِ صاف، شےِ دیگر، شےِ لطیف، پےِ دنیا، درپےِ آزار۔

اضافت اور توصیف کے وقت اشعار میں کہیں اس ''ے'' کے ساتھ ہمزہ بھی ادا ہوتا ہے اور شمار میں آتا ہے اردو نثر میں بھی ''ے'' پر کسرہ ادا کرنے سے آسان ہمزہ ادا کرنا ہے، اس لیے اگر ایسے الفاظ ہمزہ کے ساتھ لکھے جائیں تو زیادہ مناسب ہے۔

جیسے: مۓ صاف، پۓ دنیا، درپۓ آزار۔

● جن لفظوں کے آخر میں واو (معروف) ہوتا ہے، اضافت اور توصیف کی صورت میں ان کے آگے بھی ''ے'' کا اضافہ کیا جاتا ہے، جیسے: ''گفتگوے شوق''۔ بوے گل، سوے چمن، خوش بوے وفا، چارسوے دہر، روے

دوست، پہلوے غیر، بازوے حبیب، آرزوے تسکین، آبروے وطن، گیسوے سیاہ، خوے بد۔

● ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جب شعر میں واو معروف خوب کھینچ کر نہ پڑھا جائے، تو اس صورت میں اسی واو پر اضافت کا زیر لگا دیتے ہیں اور ''ے'' کا اضافہ نہیں کرتے جیسے: ع گیسوِ تابدار کو اور بھی تابدار کر۔ یا جیسے: ع دکھنے لگے پہلوِ فراشی۔ یہ مناسب طریقہ ہے مگر اس کا تعلق نظم سے ہے۔ نثر میں ہمیشہ ایسے موقعوں پر ''ے'' کا اضافہ کیا جائے گا۔

● جن لفظوں کے آخر میں واو ہو اور اس سے پہلے والے حرف پر زبر یا سکون ہو، جیسے پیرو، سرو، تو اضافت کی صورت میں اس واو پر زیر آجائے گا، ''ے'' کا اضافہ نہیں کیا جائے گا۔، جیسے:

پیرَوِ استاذ، خدیوِ جہاں، سروِ باغ، دیوِ سفید۔

● جب لفظ کے آخر میں ہائے خفی ہو تو اضافت اور توصیف کی صورت میں اس ''ہ'' پر ہمزہ لگایا جائے گا، جیسے: خانۂ خدا، کشتۂ معشوق، جذبۂ دل، جغرافیۂ ہندوستان، مرتبۂ بلند، مدینۂ منورہ، سایۂ آرام دہ۔

اعداد

۱۔ لفظ ''دونوں'' جو دو کے عدد میں تاکید کے لیے آتا ہے نون غنہ کے ساتھ اور اس کے بغیر دونوں طرح لکھا جاتا ہے۔ اس کا اور اسی طرح دوسرے تاکیدی اعداد کا صحیح املا نون غنہ کے ساتھ ہے، جیسے: دونوں، تینوں، چاروں وغیرہ۔

۲۔ لفظ ''چھ'' کا املا کئی طرح کیا جاتا ہے، چھ، چھہ، چھے۔ صحیح املا آخر میں ''ہ'' یا ''ے'' کے اضافے کے بغیر ''چھ'' ہے۔ اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔

۳۔ گیارہ سے اٹھارہ تک گنتیوں کے آخر میں ہائے خفی ہے۔ اس لیے ان کے آخر میں ہمیشہ ''ہ'' لکھنی چاہیے۔ بعض لوگ ان کا تلفظ نون غنہ سے کرتے ہیں (جیسے

گیاراں) یہ لہجہ معیاری نہیں۔ صحیح املا گیارہ، بارہ، تیرہ..... ہے۔

۴- جب یہ گنتیاں اعداد ترتیبی میں تبدیل ہو جاتی ہیں تو ہائے خفی کو اپنی حالت پر باقی رکھا جائے، اس کو "ہائے" مخلوط (ھ) سے بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یعنی اس طرح لکھا جائے:

گیارہواں، بارہواں، تیرہواں۔

۵- اسی طرح اعدادِ تاکید کو بھی ہائے خفی سے لکھنا چاہیے۔ جیسے:

گیارہوں، بارہوں، تیرہوں۔

۶- انتیس سے اڑتالیس تک ہر ایک میں آخر کی "س" سے پہلے "ی" لکھنا صحیح ہے۔ جیسے: انتیس، تیس، اکتیس، انتالیس، چالیس، سینتالیس وغیرہ۔

۷- ذیل کے اعداد کبھی نون غنہ کے ساتھ اور کبھی اس کے بغیر بولے جاتے ہیں۔ ان کو نون غنہ کے ساتھ لکھنا صحیح ہے:

تینتیس، چونتیس، سینتیس، پینتالیس، سینتالیس، پینسٹھ۔

۸- ۵۱، ۸۱، ۹۱ اور ۹۹ کو کبھی بہ اضافۂ "ی" اور کبھی اس کے بغیر لکھتے ہیں۔ انھیں "ی" سے لکھنا صحیح ہے:

اکّیاون، اکّیاسی، اکّیانوے۔ لیکن کوئی شخص عام تلفظ کے مطابق اکاون، اکانوے لکھتا ہے تو یہ بھی غلط نہ ہوگا۔

۹- لفظ سیکڑا نون غنہ کے ساتھ بھی مروج ہے، لیکن اسے بیش تر نون غنہ کے بغیر لکھتے ہیں، اور یہی زیادہ مروج ہے اس لیے بغیر غنہ کے لکھنا زیادہ مناسب ہے اور تلفظ میں بھی آسان ہے۔

۱۰- عددِ ترتیبی کی ملفوظی صورت یوں ہوگی:

چوبیسواں، اڑتیسواں، باسٹھواں، اکیاسیواں، بیاسیواں وغیرہ۔ اسے اس

طرح بھی لکھا جا سکتا ہے:

۲۴واں، ۳۸واں، ۶۲واں، ۸۱واں، ۸۲واں، وغیرہ۔

۱۱۔ سو سے آگے کی ترتیبی گنتیوں کو بھی ہندسہ لکھ کر ''واں'' یا ''ویں'' کے اضافے سے لکھنا مناسب ہے۔ جیسے: ۱۰۱واں، ۱۵۱واں، ۷۸۶واں وغیرہ۔

۱۲۔ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، اربوں کو ملفوظی طور پر ہی لکھنا مناسب ہے، لیکن بڑے اعداد مثلاً ۱،۲۷،۵۱۶ (ایک لاکھ ستائیس ہزار پانچ سو سولہ) کو ترتیبی صورت میں ہندسے کے بعد ''واں'' یا ''ویں'' کے اضافے سے لکھنا ہی مناسب ہوگا۔

مرکبات

مرکبات میں جہاں تک ہو سکے، الفاظ الگ الگ لکھے جائیں اس سے ان کے مفردات کا پتہ چلے گا، جیسے:

خوب صورت، خوش رنگ، نیک بخت، گل بدن، آج کل، دل لگی، گل دستہ، ہم رنگ، جفا شعار، توپ خانہ، بت خانہ۔

ان میں سے ہر لفظ الگ سے اپنا معنی رکھتا ہے، اس لیے ترکیب کی صورت میں بھی الگ، الگ لکھنا چاہیے۔

لیکن کچھ مرکب الفاظ ملا کر لکھے جاتے ہیں، مثلاً: شبنم، شمشیر۔ انھیں اسی طرح لکھنا مناسب ہے۔ ''پیچیدہ'' ایک لفظ ہے اس کو ''پے چیدہ'' لکھنا غلط ہے۔

مشتقات

مشتقات سابقوں یا لاحقوں کے ملانے سے بنتے ہیں۔ بہ، بے، سار، گار، دار، زار، ور، گر، گسار، بان، آن، رساں، ساں، گیں، پن، لا وغیرہ یہ تنہا استعمال نہیں ہو سکتے اور تنہا اردو میں کوئی معنی بھی نہیں رکھتے۔ جب الگ سے

ان کا کوئی معنی نہیں تو الگ لکھنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں۔

اس لیے مشتقات کو جہاں تک ممکن ہو، ملا کر لکھنا چاہیے۔ اور الگ بھی لکھ سکتے ہیں:

کمتر، بیشتر، ستمگر، پیشتر، پاسبان، جانور، تاجور، کرخدار، زمیندار، شاندار، دلدار، جہاندار، ایماندار، مہماندار، دکاندار، چمکدار، دستگیر، جہانگیر، عالمگیر، دلگیر، خاکسار، دلکش، غمگین، اندوہگیں، ایلچی، مشعلچی، دیگچی، شرمسار، شاخسار۔

لیکن آفاق گیر، ملک گیر، دامن گیر، کف گیر، میں ''گیر'' اور کانٹے دار، لچھے دار میں ''دار'' الگ لکھے جاتے ہیں یہ رائج املا ہے اسے باقی رکھنا چاہیے۔

وہ مشتقات جن کا پہلا جز کچھ حذف واضافے کے ساتھ ہوتا ہے ان کو الگ کر کے لکھنا درست نہیں۔ جیسے:

خریدار، بچپن، لڑکپن، سرمگیں، باغیچہ۔

سابقہ اَن

سابقہ ''اَن'' کو جو نفی کا معنی دیتا ہے اردو میں الگ سے لکھنے کا چلن ہے، اسے الگ ہی لکھا جائے، مثلاً:

ان پڑھ، ان گھڑ، ان گنت، ان سنی، ان کہی، ان دیکھا، ان بوجھ وغیرہ۔

سابقہ ''بے''

سابقہ ''بے'' کو زیادہ تر الگ ہی لکھا جاتا ہے اور یہی طریقہ زیادہ مناسب ہے۔ جیسے:

بے ریا، بے خوف، بے مزہ، بے تحاشا، بے حساب، بے بس، بے شک، بے رخی، بے ثبات، بے خواب، بے جان، بے رحم، بے ایمان، بے گناہ، بے دھڑک، بے گھر، بے آسرا، بے ڈھنگا، بے کیف، بے آب، بے آبرو، بے اثر، بے ادب،

بے باق، بے باک، بے تدبیر، بے توجہ، بے ٹکٹ، بے حجاب، بے کار، بے گانہ، بے تاب، بے وقوف، بے ہوش، بے حد، بے دم، بے دل، بے خود، بے کل، بے زار، بے قدر، بے کس وغیرہ۔

ہاں اگر کوئی لفظ عَلَم کی حیثیت اختیار کر چکا ہو تو اسے خاص عَلَم کی صورت میں ملا کر لکھنا ہی مناسب ہے۔ مثلاً: بیدم، بیدل، بیخود، بیکل، بیکس وغیرہ۔

سابقہ "بہ"

سابقہ "بہ" کو عام طور سے ہائے مختفی کے بغیر ملا کر لکھنے کا رواج ہے، اس لیے اس کو ملا کر ہی لکھنا مناسب ہے۔ جیسے: بخوبی، بہرحال، بدستور، بخدا، بدقت، بدولت، بانداز خاص، بخدمت، بکثرت، بجز، بجائے، بہم، بنسبت، بمقابلہ، وغیرہ۔

لاحقے چہ، کہ

چہ، کہ۔ لاحقے ہیں اور مشتقات میں استعمال ہوتے ہیں، ان دونوں کی ملی ہوئی شکلیں مانوس ہیں مگر ان میں سے "چہ" کو ملا کر لکھنا ہی مناسب ہے، جیسے: بازیچہ، غالیچہ، دیگچہ، نیچہ وغیرہ۔ البتہ "چناں چہ کو الگ الگ لکھا جائے۔

اور "کہ" لاحقے والے الفاظ جیسے غرضیکہ، حالانکہ، بشرطیکہ، کیونکہ، چونکہ، وغیرہ کو الگ الگ لکھنا بہتر ہے: غرضے کہ، حالاں کہ، بشرطے کہ، کیوں کہ، چوں کہ، وغیرہ، البتہ "بلکہ" کو ملا کر لکھا جائے گا، "بل" الگ اور "کہ" الگ لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں، اس لیے کہ اردو میں "بلکہ" مکمل ایک لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ضمائر اور کلمات جار[1] کا استعمال

بعض اوقات ضمائر کو کلماتِ جار کے ساتھ ملا کر لکھا جاتا ہے، مثلاً مجھکو، تجھکو، اسنے، اسلیے، انھیں غلط تو نہیں کہا جا سکتا، البتہ الگ لکھنا بہتر ہے: مجھ کو، تجھ کو، اس نے، اس لیے، مجھ سے، ہم پر، جس کا، اسی طرح، کے لیے، کے واسطے، جب تک، کیوں کر، جان کر، وغیرہ کو بھی ملا کر نہیں لکھنا چاہیے۔

گا، گے، گی۔

گا، گے، گی کو افعال کے ساتھ ملا کر نہیں، بلکہ الگ الگ لکھنا چاہیے:

جائے گا، پڑھے گا، کھائیں گے، چاہیں گے، پکائے گی، کھلائے گی۔

لفظوں کو ملا کر اور الگ الگ لکھنا

الف:۔ لفظوں کے درمیان فاصلہ رکھا جائے اور یہ فاصلہ یکساں ہو۔ نیز اس فاصلے

---

[1] حروف جارہ: یہ وہ کلمات ہیں جو اسم یا ضمیر کے بعد آ کر ان کا تعلق کسی فعل یا صفت کے ساتھ ظاہر کریں۔ ان سے پہلے جو اسم یا ضمیر ہوتا ہے وہ مجرور کہلاتا ہے۔ مثلا: زید گھوڑے پر سوار ہے۔ یہاں حرف جار ''پر'' گھوڑے کے بعد آ کر سوار اور گھوڑے کا تعلق ظاہر کرتا ہے پھر ''سوار'' اپنے متعلق سے مل کر زید مبتدا کی خبر بن رہا ہے۔ خالد دہلی سے آ رہا ہے۔ یہاں حرف جار ''سے'' دہلی کے بعد آ کر فعل ''آ رہا ہے'' اور ''دہلی'' کا تعلق بتاتا ہے۔ واضح رہے کہ عربی میں حرف جار پہلے اور مجرور بعد میں ہوتا ہے۔ جیسے فِي بيوتٍ، برحمةِ اللّٰه، إلىٰ صراطٍ، میں في، ب، اور إلىٰ حروف جار ہیں اور ان کے بعد والے کلمات مجرور ہیں۔

اردو میں حروف جر اکثر یہ کلمات ہوتے ہیں:

میں ۔ سے ۔ پر ۔ تک ۔ اوپر ۔ سمیت ۔ اندر ۔ باہر ۔ آس پاس ۔ نیچے ۔ آگے ۔ سامنے ۔ سنگ ۔ کو ۔ لیے ۔ مارے۔

ان کے علاوہ بہت سے فارسی و عربی کے الفاظ بھی حروف رابطہ کا کام دیتے ہیں، مثلاً: بغیر ۔ بدون ۔ نزدیک ۔ طرف ۔ درمیان ۔ قبل ۔ بعد ۔ باعث ۔ واسطے ۔ سبب ۔ سوا ۔ نسبت ۔ بجائے ۔ بجز ۔ موجب ۔ علاوہ ۔ گرد ۔ باوجود وغیرہ۔ (زبدۃ القواعد:۔ ص:۱۲۳، ۱۲۴۔ بہ تصحیح و اضافہ)

سے زیادہ ہو جو ایک ہی لفظ کے دو ٹکڑوں کے بیچ میں رکھا جائے۔

ب :- ایک لفظ کے اوپر دوسرا لفظ یا ایک حرف کے اوپر دوسرا حرف کسی حالت میں نہ لکھا جائے۔

رموز اوقاف

رموز اوقاف ان علامتوں کو کہتے ہیں جو ایک جملے کو دوسرے جملے سے یا کسی جملے کے ایک حصہ کو دوسرے حصوں سے جدا کرتے ہیں، ان کے استعمال سے عبارت کے مختلف اجزا کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس لیے ان علامتوں کو استعمال میں لانا چاہیے، یہ علامتیں حسب ذیل ہیں:

نمبر شمار	رموز	اردو نام	انگریزی نام	اردو تلفظ
۱	۔	کامل وقفہ/ختمہ	Full Stop	فل اسٹاپ
۲	،	سکتہ	Comma	کاما
۳	؛	نیم وقفہ	Semi Colon	سیمی کالن
۴	:	تفسیریہ/رابطہ	Colon	کالن
۵	:-	تفصیلیہ	Colon and Dash	کالن اینڈ ڈیش
۶	؟	استفہامیہ/سوالیہ	Note of Interrogation	نوٹ آف انٹروگیشن
۷	!	فجائیہ/ ندائیہ	Note of Exclamation	نوٹ آف ایکس کلیمیشن
۸	( )	قوسین	Brackets	بریکٹس
۹	" "	واوین	Inverted Commas	انورٹیڈ کاماز
۱۰	—	خط	Dash	ڈیش
۱۱	=	متساویہ	Sign of Equation	سائن آف ایکویشن

(۱) کامل وقفہ (۔): یہ سب سے بڑا ٹھہراو ہے اور مکمل جملے کے خاتمے پر

استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی مخففات کے بعد بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے مکمل جملہ: الجامعۃ الاشرفیۃ علوم وفنون کا عظیم مرکز ہے۔ وغیرہ ۔ انگریزی مخففات: ایس۔ٹی۔ڈی۔، پی۔سی۔او۔ وغیرہ۔

(۲) سکتہ (،):- یہ سب سے چھوٹا ٹھہراو ہے اور حسب ذیل مواقع پر استعمال ہوتا ہے۔

(الف) ایک ہی حکم کے تین یا تین سے زیادہ کلمات یا جملے کے بیچ میں جو ساتھ ساتھ استعمال کیے گئے ہوں۔ جیسے: حامد، خالد، شمیم اور فہیم کمرے میں داخل ہوئے۔ سلیم اپنے درجے میں داخل ہوا، استاد کو سلام کیا، ساتھیوں کی خیر خیریت لی اور پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

(ب) ندائیہ الفاظ کے بعد۔ جیسے: جناب صدر اجلاس، حاضرین وحاضرات! بزرگو، عزیزو اور بچو!۔

(ج) جب الفاظ مختلف ٹکڑوں میں استعمال ہوں۔ جیسے: خوش حالی ہو کہ پریشانی، اللہ کو ہر حال میں یاد کرنا چاہیے۔

(د) ایسے اجزاے جملہ کے درمیان جو کہ تشریحی ہوں۔ جیسے: یہ میز چھ فٹ لمبی، تین فٹ چوڑی، اور ڈھائی فٹ اونچی ہے۔

(ہ) چھوٹے چھوٹے ہم رتبہ فقروں کے درمیان۔ جیسے: بادل گرجا، بجلی چمکی، بارش ہوئی۔

(ز) فقرۂ خاص اور فقرۂ تبعیہ کے درمیان۔ جیسے: چوں کہ وہ بیمار تھا، اس لیے نہ آسکا۔

(۳) نیم وقفہ (؛):- جب سکتے سے زیادہ وقفہ کی ضرورت پڑے۔ یہ حسب ذیل موقعوں پر استعمال ہوتا ہے۔

(الف) ایسے لمبے لمبے ہم رتبہ فقروں کے درمیان جن میں سکتے پائے جائیں۔ جیسے: وہ بڑا اعقل مند، سخی اور ہنس مکھ تھا؛ ہم اس کی عزت کرتے تھے۔

(ب) ایسے جملوں کے درمیان جو بغیر حرف عطف کے استعمال ہوں۔ جیسے: جو محنت کرے گا؛ کامیاب ہوگا، جو وقت کا زیاں کرے گا؛ شرمندگی اٹھائے گا۔

(۴) تفسیریہ (:) :- اس کا ٹھہراو نیم وقفہ کے ٹھہراو سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے مواقع استعمال حسب ذیل ہیں۔

(الف) عموماً اس کا استعمال وہاں ہوتا ہے، جہاں کسی سابقہ جملے کی تشریح یا تصدیق کی جاتی ہے۔ جیسے: کیا خوب سودا نقد ہے: اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے۔

(ب) مقولے یا کہاوت سے پہلے اور تمہیدی فقرے کے بعد۔ جیسے: سچ ہے: "جو بوئے گا کاٹے گا"۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے: "اپنا عیب کسی کو نظر نہیں آتا"۔

(۵) تفصیلیہ (:-) :- (۱) اس کا استعمال زیادہ تر بڑے اقتباس یا فہرست پیش کرتے وقت ہوتا ہے۔ جیسے:

خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:-

....

جامعہ کے درج ذیل طلبہ نے امتیازی نمبر حاصل کیے:-

....

(۲) ایک ہی جملے میں کئی باتیں مسلسل پیش کرنے کے لئے، جیسے: میرا روز کا معمول کچھ اس طرح ہے:- صبح تڑکے اٹھتا ہوں، نماز فجر سے فارغ ہو کر قرآن کی تلاوت کرتا ہوں، نہادھو کر ناشتہ کرتا ہوں اور مدرسہ چلا جاتا ہوں۔

(۶) استفہامیہ (؟) :- اس کا استعمال سوالیہ جملوں کے آخر میں ہوتا ہے۔ جیسے: تمھارا نام کیا ہے؟۔ ابھی کمرے میں کون داخل ہوا؟۔

(۷) فجائیہ (!) :- ان الفاظ یا فقرات کے بعد لگایا جاتا ہے جن سے کوئی جذبہ اور دل کی کیفیت ظاہر ہو۔ جیسے: آہا! بارش کا موسم بن رہا ہے، اب ضرور بارش ہوگی۔ افوہ! درد نے جان لے لی۔ افسوس! تو نے اپنا وقت برباد کر دیا۔

(۸) ندائیہ (!) :- اگر یہی علامت منادیٰ کے ساتھ لائی جائے تو اسے ندائیہ کہیں گے۔ جیسے:

اے عشق! ترے صدقے جلنے سے چھٹے سستے
جو آگ بجھا دے گی وہ آگ لگائی ہے (رضا بریلوی)

(۹) قوسین (( )):- عام طور پر جملہ معترضہ اور توضیحی لفظ کو قوسین میں لکھتے ہیں اور قوسین کے دائیں بائیں کے الفاظ ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ اگر قوسین کے الفاظ حذف کردیں تو بقیہ الفاظ سے عبارت بغیر کسی خلل کے پوری رہے گی۔ جیسے: حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ (جو دورِ اکبری کے عظیم دینی رہنما تھے) کی کتاب مکتوبات امام ربانی بہت مشہور ہے۔

(۱۰) واوین (" "):- مقولے یا اقتباس کے اول و آخر میں یہ علامت لگائی جاتی ہے۔ جیسے: حافظ ملت نے فرمایا: "زمین کے اوپر کام زمین کے نیچے آرام"

(۱۱) خط/ڈیش (—):- خط کامل وقفہ سے کچھ بڑا ہوتا ہے اس کے مواقعِ استعمال حسب ذیل ہیں:

(الف) جملہ معترضہ کے اول و آخر میں۔ جیسے: اگر ساجد اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتا — ہماری قسمت ایسی کہاں — تو بیرونِ ملک جانے کی راہ ہموار ہو جاتی۔

(ب) جب کئی لفظ کسی سابقہ لفظ کی تشریح اور تبادلے میں لکھے جائیں تو یہ علامت لگائی جاتی ہے۔ جیسے: سارا مکان — اینٹ، چونا، لکڑیاں — سب جل کر خاک ہو گیا۔

زید — نہ صرف زید اس کا سارا خاندان — ان ہی بزرگ کا معتقد ہے۔

(۱۱) متساویہ (=):- مرکب الفاظ کے اجزا بیان کرنے کے لیے مرکب کے بعد استعمال کرتے ہیں۔ جیسے: آموزگار = آموز + گار۔ حسن افروز = حسن + افروز۔

مخففات

اردو تحریروں میں جو مخففات اور نشانات عام طور سے رائج ہیں، ان میں سے خاص خاص یہ ہیں:

ـــ : یہ تخلص کی علامت ہے اور "بت" کی تخفیفی صورت ہے اور بت "برائے تخلص" کا مخفف ہے۔ یہ نشان تخلص کے اوپر لگایا جاتا ہے، جیسے: اقبالؔ، حسرتؔ، فانیؔ۔

ـــ : خاص خاص ناموں پر ایک لکیر کھینچ دی جاتی ہے، تاکہ وہ عبارت نمایاں معلوم ہو۔ جیسے: حافظ ملت، جامعہ اشرفیہ کے بانی ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب اشعۃ اللمعات فارسی زبان میں مشکاۃ کی شرح ہے۔ لال قلعہ، دہلی میں ہے۔ امام احمد رضا نے فتاوی رضویہ میں لکھا ہے۔

. . . : یہ تین نقطے وہاں لگائے جاتے ہیں، جہاں سے عبارت کا کچھ حصہ یا کوئی لفظ حذف ہو۔

ع : یہ مصرع کی علامت ہے جیسے ع: بندہ بھی ہوں تو کیسے بڑے کارساز کا

ے : یہ لفظ بیت کی مخفف صورت ہے۔ جب کہیں کوئی شعر نقل کرنا ہوتا ہے تو شروع میں یہ نشان لگاتے ہیں۔ جیسے: ے

دردِ دل کر مجھے عطا یارب دے مرے درد کی دوا یارب

یہی نشان حواشی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسے متن میں اس جگہ لگاتے ہیں، جہاں یہ ظاہر کرنا ہو کہ اس سے متعلق حاشیہ میں کچھ ضروری باتیں لکھی گئی ہیں۔ اس نشان پر نمبر ہوتا ہے۔ وہی نشان اور نمبر حاشیے میں لکھا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہ حاشیہ کس عبارت کا ہے جیسے:

ے۱، ے۲، ے۳ وغیرہ

ص : یہ نشان صفحے کا مخفف ہے، جب ''ص'' لکھتے ہیں تو صفحہ نمبر اس کے آگے لکھتے ہیں، جیسے سفینۂ بخشش، ص ۴۶ اور جب ''صـــ'' لکھتے ہیں تو صفحہ نمبر اس کے اوپر لکھتے ہیں۔ جیسے: قواعد اردو صـــ۱۰۶۔

ج : یہ جلد کا مخفف ہے۔ جیسے: بہار شریعت، ج:۴۔

ق : یہ قطعہ بند کی علامت ہے۔ یہ علامت ان دو اشعار کے درمیان لگائی جاتی ہے، جن کا مضمون مسلسل اور باہم مربوط ہوتا ہے۔ جیسے: ے

کاش محشر میں جب ان کی آمد ہو اور بھیجیں سب ان کی شوکت پہ لاکھوں سلام
ق
مجھ سے خدمت کے قدسی کہیں ہاں رضاؔ مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

ق م : یہ قبل مسیح کا مخفف ہے۔ جیسے: ۱۰۰۰ ق م۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ایک ہزار سال پہلے۔

تع : یہ تعالیٰ کا مخفف ہے۔

عہ : یہ علیہ السلام کا مخفف ہے۔

ص/صلعم : یہ ''صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم'' کا مخفف ہے۔

رض : یہ ''رضی اللہ عنہ'' کا مخفف ہے۔

رح : یہ ''رحمۃ اللہ علیہ'' یا ''رحمہ اللہ'' کا مخفف ہے

تع، عہ، ص، صلعم، رض، رح : ان تمام مخففات سے علمائے کرام نے منع فرمایا ہے۔ خصوصاً رب تعالیٰ کی تعظیم اور انبیا علیہم السلام پر درود و سلام کے الفاظ کی تخفیف سخت ناپسندیدہ و ناجائز ہے۔ اس لیے اس سہل پسندی سے بچنا ضروری ہے۔ حضرت امام سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ: پہلا شخص جس نے درود شریف کا ایسا اختصار کیا اس کا ہاتھ کاٹا گیا.... صحابہ اور اولیائے کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اسمائے طیبہ کے ساتھ ''رضی اللہ تعالیٰ عنہ'' کی جگہ ''رض'' لکھنے کو ہمارے علمائے کرام نے مکروہ اور باعث محرومی بتایا۔ یوں ہی ''قدس سرہ'' یا ''رحمۃ اللہ علیہ'' کی جگہ ''ق'' یا ''رح'' لکھنا بھی باعث محرومی ہے، ایسی باتوں سے احتراز چاہیے۔

؍؍ : یہ ''ایضاً'' کی علامت ہے۔ یہ علامت کسی عبارت، جملے یا لفظ کے نیچے لگاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بات اوپر لکھی گئی ہے وہی نیچے بھی ہے۔ جیسے:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفۂ اول تھے۔

〃 عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ 〃 دوم تھے۔
〃 عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ 〃 سوم تھے۔
〃 علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ 〃 چہارم تھے۔

کذا : یہ ''کذا فی الاصل'' کا مخفف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اصل متن کی ہو بہو نقل ہے، خاص طور سے یہ اس وقت لکھتے ہیں جب اس پر غلط ہونے کا گمان ہو۔

الخ : عبارت یا شعر پورا نقل کرنے کے بجائے ابتدائی لفظ لکھ کر ''الخ'' لکھ دیتے ہیں۔ یہ مخفف ہے ''الی آخرہ'' کا یعنی پورا شعر یا عبارت مراد ہے۔

۱۲ : یہ ہر ایک حاشیے کی عبارت کے آخر میں لکھا جاتا ہے۔ یہ لفظ ''حد'' کا عدد ہے۔ یعنی یہاں حاشیے کی عبارت پوری ہوگئی۔

/ / : اگر کوئی مصرع یا شعر عبارت میں بغیر سطر بدلے لکھا جائے تو اس کے دونوں طرف ایک ایک آڑی لکیر لگا دیتے ہیں۔ مصرع کی مثال: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اہل وطن نے سر پر کفن باندھ کر انگریزوں کے مقابلے میں یہ ثابت کر دیا کہ ع / سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا سکتے نہیں / شعر کی مثال: مفتی کفایت علی کافی مراد آبادی کو جب انگریز تختۂ دار کی طرف لے چلے تو ان کی زبان پر نعت شریف کا ورد تھا، جس کا مطلع یہ ہے ۔ /کوئی گل باقی رہے گا، نے چمن رہ جائے گا پر رسول اللہ کا دین حسن رہ جائے گا/

حصۂ دوم : انشا پردازی

مضمون نویسی کے اصول و آداب

کسی موضوع کے متعلق اپنے خیالات آسان، خوب صورت اور موزوں الفاظ میں تسلسل کے ساتھ تحریری شکل میں پیش کرنا ''مضمون نویسی'' کہلاتا ہے۔

مضمون نویسی علم ادب کا ایک اہم جز ہے جو مستقل فن کی حیثیت رکھتا ہے، اس فن کے ذریعہ مضمون نگار علمی، ادبی، تاریخی اور دیگر بہت سی معلومات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اچھا مضمون لکھنے کے لیے ذخیرۂ معلومات اور خزانۂ الفاظ کے ساتھ وسیع مطالعہ اور بار بار لکھنے کی مشق ضروری ہے۔ مطالعہ سے نہ صرف معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، بلکہ انشا پردازی کے طرز سے واقفیت بھی ہوتی ہے۔

مضمون نویسی میں مہارت حاصل کرنے کے لیے چند خاص خاص باتیں ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

(۱) مضمون لکھنے سے پہلے اس موضوع کے تمام اہم پہلوؤں کا ایک خاکہ ذہن میں بنالیا جائے جس پر مضمون لکھنا ہے، یعنی مضمون کی تمہید کیا ہو، کون کون سی باتیں مضمون میں لائی جائیں پھر کس ترتیب سے لکھی جائیں وغیرہ۔

(۲) اپنے خیالات کے اظہار کے لیے آسان، پر اثر اور صحیح زبان استعمال کی جائے۔

(۳) تحریر میں الجھاو، الفاظ کی تکرار اور غیر ضروری باتوں سے پرہیز ہو۔

(۴) تحریر میں تسلسل، ربط، حسن ترتیب اور دل نشینی لازمی ہے۔

(۵) جس موضوع پر لکھنا ہو، اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرلی جائیں۔ جب تک ذہن میں معلومات کا ذخیرہ نہ ہو، ہرگز قلم نہ اٹھانا چاہیے۔ اس لیے کہ ایسی صورت میں مضمون مواد سے عاری اور افادہ سے خالی ہوگا۔

(۶) مضمون کئی پیراگرافوں میں تقسیم کر کے لکھنا چاہیے۔ پورا مضمون ایک پیراگراف میں لکھنا غلط ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب ایک قسم کی بات مکمل ہو جائے تو پیراگراف بدل دیا جائے، وہ اس طرح کہ نئی سطر ایک ڈیڑھ لفظ کی جگہ چھوڑ

کر شروع کی جائے اور باقی سطریں اپنی جگہ سے لکھی جائیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جب صفحہ بدلے تو پیرا گراف بھی بدل جائے لہٰذا صفحہ کے ساتھ ساتھ اگر پیرا گراف بھی نیا شروع ہو رہا ہو تو اس کی جگہ چھوڑ کر لکھیں گے ورنہ کچھ جگہ چھوڑے بغیر لکھیں گے۔ طلبہ اس میں بہت غلطی کرتے ہیں۔

(۷) مضمون کا آغاز دل چسپ اور پر کشش جملوں سے ہو کہ پڑھنے والے پر اچھا اثر ڈالے اور اس کی طبیعت شروع سے ہی مضمون پڑھنے کی طرف مائل ہو۔ مضمون کی طرف قاری کا میلان ہی مضمون نگار کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

(۸) اپنی بات کم الفاظ میں کہنے کی کوشش کی جائے اور غیر ضروری باتوں سے پرہیز کیا جائے۔ الفاظ زیادہ اور معانی کم ہوں تو اس سے مضمون کا معیار گر جاتا ہے۔ ہاں! اتنا زیادہ اختصار بھی نہ ہو کہ مطلب ہی واضح نہ ہو سکے۔

(۹) مضمون کی زبان خود اپنی زبان ہو، اسے رنگین بنانے کی کوشش نہ کی جائے، بسا اوقات رنگین بنانے کے چکر میں مضمون کے اندر بھدا پن آ جاتا ہے۔ زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہو کہ کم پڑھا لکھا آدمی بھی آسانی سے سمجھ لے، غیر مانوس الفاظ اور پیچیدہ ترکیبیں ہرگز نہ استعمال کی جائیں۔ اگر مضمون اہل علم کے لیے ہے تو علمی زبان استعمال کرنا ہی بہتر ہے۔

(۱۰) بار بار کسی لفظ کو دہرانا مضمون کو خراب کر دیتا ہے اور مضمون نگار کے ذخیرۂ الفاظ کی قلت کا پتا دیتا ہے۔ اس لیے تکرار الفاظ سے بچنا چاہیے۔

(۱۱) مضمون نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ معیاری قلم کاروں اور ادیبوں کی تحریریں بار بار پڑھے اور پڑھنے کے دوران اس بات کی طرف توجہ دے کہ مضمون نگار نے اپنے خیالات کا اظہار کن پیرایوں میں کیا ہے، الفاظ اور جملوں کی ترکیب کیسی رکھی ہے۔

(۱۲) مضمون مکمل کر لینے کے بعد اسے کم از کم ایک بار تنقیدی نظر سے ضرور دہرا لینا چاہیے۔

مضمون کے اجزا

مضمون کے تین جز ہوتے ہیں:

ا:۔ تمہید ۲:۔ نفس مضمون ۳:۔ اختتامیہ

تمہید: یہ مضمون کا اہم اور پہلا حصہ ہے، اس میں نفس مضمون سے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے چند ایسے موثر اور زوردار جملے لکھے جاتے ہیں جن سے پڑھنے والوں کے ذہن اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوں اور ان کی دل چسپی بھی بڑھے۔

نفس مضمون: یہ اصل مضمون کا درمیانی حصہ ہوتا ہے، اس میں موضوع سے متعلق تفصیلی گفتگو کی جاتی ہے۔ مضمون نگار کو چاہیے کہ اپنی بات پیش کرنے کے لیے جو بھی پہلو اختیار کرے وہ دلیلوں سے مزین اور حقائق کی روشنی میں ہو۔ چوں کہ یہ حصہ طویل ہوتا ہے، اس لیے اسے متعدد پیراگرافوں میں تقسیم کر لینا چاہیے۔

اختتامیہ: یہ مضمون کا آخری حصہ ہوتا ہے، اس میں خیالات کا نچوڑ اچھے انداز میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ پڑھنے والا متاثر ہو اور آسانی کے ساتھ مضمون پر اپنی رائے قائم کر سکے یا اس سے کچھ نتیجہ اخذ کر سکے۔

ان تینوں اجزا کے درمیان ایسا مضبوط تعلق ہونا چاہیے کہ پڑھنے والے کو کہیں بھی بے ربطی کا احساس نہ ہو۔

مثال کے طور پر درج ذیل مضمون دیکھیں، جس میں تمہید، نفس مضمون اور اختتامیہ کو الگ الگ کر کے دکھایا گیا ہے۔

جبری جہیز کی لعنت۔

تمہید: ہمارے ملک ہندوستان میں مسلم معاشرہ ہو یا غیر مسلم، دونوں میں نکاح جیسے پاکیزہ رشتے کا استحکام ایسی رسوم وخرافات پر موقوف تصور کیا جاتا ہے جو نہ صرف وہمی اور غیر عقلی ہیں بلکہ بعض اوقات انسانی زندگی کی تباہی کا سبب بھی ہوتی ہیں۔ اگر کسی وجہ سے یہ نہ ہوا تو باہمی روابط میں تلخی اور ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ ان بری رسموں سے

عقدِ نکاح کو اس طرح مشروط کیا جاتا ہے کہ گویا لڑکے اور لڑکی کے درمیان کامل یک جہتی اور رفاقت اسی وقت ہو سکتی ہے جب یہ رسمیں ادا کر لی جائیں۔

نفسِ مضمون: انھی رسوم میں سے ایک بدترین رسم نمائشی اور جبری جہیز ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ لڑکے والوں کی طرف سے یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ اتنا مال، اتنا سامان یا فلاں گاڑی، فلاں فلاں قیمتی اشیا اگر دو گے تو تمھاری لڑکی سے ہمارے لڑکے کا رشتہ ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔ بعض صوبوں اور ملکوں میں اس طرح کا مطالبہ لڑکی والوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ مطلوبہ نقد و سامان کی ادائیگی دوسری جانب سے ہو تو رشتۂ نکاح عمل میں آئے گا ورنہ نہیں۔ یہ معاملہ کسی بھی طرح رشوت سے کم نہیں۔

تاریخ اسلام کے مطالعہ سے اب تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ دورِ ظلمت میں کوئی ایسی قوم بھی گزری ہے، جس نے شادی، بیاہ میں رشوت جیسی حرام و ناجائز چیز کو لازم قرار دیا ہو کہ اس کے بغیر شادی کا وجود ناممکن سا ہو گیا ہو۔

لیکن عہدِ جدید کی ذہنی پستی اور نفس پرستی کا یہ افسوس ناک المیہ ہے کہ نکاح جیسا پاکیزہ رشتہ جبری جہیز کی صورت میں آمدنی کا بڑا آسان ذریعہ بن گیا ہے۔ کیوں کہ عقدِ مناکحت میں رشوت لینے کا زور بڑھ رہا ہے، اخلاقی احساس و شعور کے فقدان کی وجہ سے اس سیلاب بلا پر بند نہ باندھا جا سکا۔ حالاں کہ اگر غور کیا جائے تو انسانی اور اسلامی نقطۂ نظر سے، قبلِ نکاح یا بعد نکاح مرد کے خاندان پر یا عورت کے خاندان پر ایسا مالی دباو ڈالنا کہ مطالبات نہ پورے ہونے کی صورت میں رشتۂ نکاح جبراً توڑ دیا جائے گا یا اس کی راہ میں ایسی رکاوٹیں پیدا کی جائیں گی جن سے نکاح وجود میں نہ آسکے، یہ بدترین قسم کی رشوت کا مطالبہ ہے۔ اس کے ناجائز ہونے میں شاید ہی کسی عقل مند کو شبہہ ہو۔

دورِ حاضر میں جبری جہیز کا رواج ہمارے سماج میں اعلیٰ پیمانے پر جاری ہے، جس کے برے اور الم ناک نتائج سے روحِ انسانی کانپ اٹھتی ہے۔ کتنے خاندان ایسے ہیں کہ اس جبر سے تباہی کے دہانے پر پہنچ گئے ہیں۔ اخبار و جرائد میں آئے دن عورتوں

کے بارے میں یہ خبریں پڑھی جاتی ہیں کہ اپنی مظلومانہ زندگی سے تنگ آ کر انھوں نے خود کشی کر لی، لاڈ پیار کی مستحق کتنی بچیوں کو نہایت بے رحمی اور سنگ دلی کے ساتھ زندہ جلا ڈالا گیا، کتنی لڑکیوں کو ظلم کے اس دیو کی بھینٹ چڑھا دیا گیا، کتنے خاندانوں کے درمیان اس سے منافرت اور تفریق کی آگ بھڑک اٹھی۔

لیکن اس جبری جہیز کی لعنت کے خلاف کوئی ایسی تحریک نہیں اٹھی جس سے انسان کے اخلاقی احساسات کو اس طرح بیدار کیا جا سکے کہ طبیعتوں میں خود نفرت و کراہت پیدا ہو جائے۔ کچھ آوازیں ضرور بلند ہوتی ہیں مگر اخلاقی حس کے مردہ ہونے کی وجہ سے دب کر رہ جاتی ہیں۔

نکاح کا ایک بڑا مقصد مرد و زن کے درمیان باہمی الفت و مودت کا خوش گوار ماحول پیدا کرنا ہے، تا کہ زندگی سکون کے ساتھ گزرے، بے کیفی اور تلخی کی زندگی سے رہائی حاصل ہو۔ قرآن کریم کے اندر ارشاد فرمایا گیا:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ أَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِنْ أَنْفُسِکُمْ أَزْوَاجاً لِتَسْکُنُوْا إِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً. (الروم۔ آیت: ۲۱۔پ: ۲۱)

اور اس (اللہ تبارک وتعالی) کی نشانیوں سے ہے کہ تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے جوڑے بنائے کہ ان سے آرام پاؤ اور تمھارے آپس میں محبت اور رحمت رکھی۔ (کنز الایمان)

نکاح کا دوسرا عظیم مقصد یہ ہے کہ انسان نرا حیوان نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر بہت سی صفات اور ایسی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں جن کی بنا پر اس کے اوپر اخلاقی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اس لیے اس کے اوپر لازم ہے کہ وہ اپنی جائز حدود میں رہ کر اپنی عصمت و پاک بازی کی حفاظت کرے۔ کیا کوئی عقل مند ان دونوں مقاصد سے انکار کر سکتا ہے؟

میں ان عجوبۂ روزگار انسانوں کی بات نہیں کرتا جو عقل و خرد کے دعوی کے باوجود انسان کو حیوانیت کی سطح سے بلند رکھنا نہیں چاہتے، بلکہ اس کو بھی ایک ترقی یافتہ حیوان قرار دے کر جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔

ان دونوں مقاصد پر غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جبری جہیز کی لعنت ان کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اس سے جنسی بے راہ روی پیدا ہوتی ہے، سکون قلب اور باہمی الفت ومودت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اس سے عورت دماغی الجھن میں مبتلا ہو کر خودکشی کے جرم کی مرتکب ہو جاتی ہے۔ یہ وہ آفت ہے جسے شوہر کے خاندان والے عورت کے اوپر نازل کرتے ہیں اور وہ ان کے ظلم وستم سے تنگ آ کر خود کو زندہ جلا ڈالتی ہے۔

اختتامیہ: اس لیے ہمارے تمام ہم وطنوں کو چاہیے کہ اس لعنت کو ختم کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جائیں اور اس فلاحی کام کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کریں۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ وہ انسانی غیرت وحمیت کا عَلَم لے کر انسان کی اخلاقی حِس کو بیدار کریں۔ کیوں کہ یہ مشترکہ آفت ہے۔ اس بلائے عظیم کے سبب پوری قوم درماندگی اور بے بسی کی حالت میں مبتلا ہے۔

(مفتی محمد نظام الدین رضوی مصباحی، صدر شعبۂ افتا جامعہ اشرفیہ)

مضمون کی قسمیں

عام طور سے مضمون تین طرح کے ہوتے ہیں:

① بیانی مضمون۔ ② حکائی مضمون۔ ③ فکری مضمون۔

① **بیانی مضمون:** وہ مضمون جس میں کسی مادی چیز مثلاً عمارت یا کسی جان دار کا بیان ہو۔ جیسے: مسجد نبوی، جامع مسجد دہلی۔ گھوڑا اور کرسی وغیرہ۔

② **حکائی مضمون:** وہ مضمون ہے جس میں کوئی واقعہ، کسی کی سوانح عمری، تفریح، سفر کے حالات یا کسی تقریب کی سرگذشت کا بیان ہو، جیسے: یوم جمہوریہ۔ میرا پسندیدہ مشغلہ۔ بس کا ایک دل چسپ سفر، سوانح خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ وغیرہ۔

③ **فکری مضمون:** وہ مضمون ہے جس کی تمام تر بنیاد افکار وخیالات پر ہوتی ہے۔ مضمون نگار غور وفکر کر کے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، اس میں بیان اور

حکایت کی گنجائش نہیں ہوتی اگر ہوتی ہے تو تبعاً اور ضمناً۔ جیسے: وقت کی اہمیت۔ اگر میں صدر جمہوریہ ہوتا۔ گرمی کی دھوپ۔ بے چاری اردو وغیرہ۔

مضامین کی قسموں کے نمونے

ذیل میں تینوں قسموں کی ایک ایک مثال بطور نمونہ پیش ہے:

نمونہ بیانی مضمون: (۱)

مسجد نبوی شریف

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو آپ نے ایک مسجد کی ضرورت محسوس کی، اس کے لیے بنو نجار کا ایک باغ منتخب ہوا، جو دو یتیم بچوں کا تھا، جن کے نام سہل اور سہیل تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مال سے اس زمین کی قیمت ادا کی گئی۔

اس میں کھجور کے درخت، مشرکین کی قبریں اور کچھ کھنڈر تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے درخت کاٹ دیے گئے، مشرکین کی قبریں کھود کر پھینک دی گئیں اور کھنڈر ہموار کر دیے گئے۔ ہادی عالم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کے بعد کام تیزی سے شروع ہو گیا، صحابۂ کرام کے ساتھ خود آقاے دو جہاں صلی اللہ تعالی علیہ وسلم بھی اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے اور جوش دلانے کے لیے ان کے ساتھ آواز میں آواز ملا کر یوں پڑھتے جاتے:

أَللّٰهُمَّ لَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُ الْآخِرَةِ فَاغْفِرِ الأَنصَارَ وَالْمُهَاجِرَةَ

ترجمہ: اے اللہ! بھلائی تو آخرت ہی کی بھلائی ہے، تو انصار وار مہاجرین کو بخش دے۔

مسجد بن کر تیار ہو گئی جس کی دیوار کچی اینٹوں کی، ستون کھجور کے تنوں کا اور کھجور ہی کے پتوں کی کی چھت تھی جو بارش کے زمانے میں ٹپکنے لگتی، گویا یہ مسجد ہر قسم کے دنیاوی تکلفات سے پاک تھی۔ مگر جب قبلہ بدل کر کعبہ ہو گیا تو اس کا قبلہ کعبہ شریف کی طرف کر دیا گیا۔ یہی مسجد، مسجد نبوی کے نام سے مشہور ہے۔

مختلف زمانوں میں اس کی تجدید و توسیع ہوتی رہی، جس کی قدرے تفصیل کچھ اس طرح ہے:

● ۷ھ/ ۶۲۸ء میں خیبر سے واپس ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے مسجد کی توسیع فرمائی، آپ نے چوڑائی میں چالیس ہاتھ اور لمبائی میں تیس ہاتھ کا اضافہ فرمایا اس طرح مسجد مربع کی شکل میں ہوگئی، اس کا مکمل رقبہ ۲۵۰۰ مربع میٹر ہوگیا۔

● خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ۱۷ھ/۶۳۸ء میں مسجد نبوی کی قد آدم تک بنیادیں پتھر سے بنوائیں اور ستون لکڑی کے بنادیے۔

● خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ۲۹ھ/۶۴۹ء میں قبلہ، یعنی جنوب کی سمت اور شمال و مغرب کی جہتوں میں اضافہ فرمایا۔قبلہ کی طرف ایک برآمدہ بنایا اور قبلہ کی دیوار اس جگہ بنائی جہاں آج ہے، مغرب کی طرف برآمدہ اور شمال کی طرف دس ہاتھ کا اضافہ کیا۔آپ کی یہ تعمیر منقش پتھروں کی تھی اور چھت ساگوان کی خوشبودار لکڑی کی۔

● خلیفہ ولید بن عبد الملک کے حکم پر حضرت عمر بن عبد العزیز نے ۸۸ھ/ ۷۰۷ء میں مسجد کی تعمیر شروع کی جو ۹۱ھ/۷۱۰ء میں تکمیل کو پہنچی۔اس تعمیر میں مغرب کی طرف بیس ہاتھ اور مشرق کی جانب تقریباً تیس ہاتھ کا اضافہ کیا گیا، اس طرح امہات المومنین کے حجرے بھی مسجد میں شامل کر لیے گئے۔شمال کی جانب بھی اضافہ کیا گیا، عہد ولید کی یہ تعمیر جدید بڑے اہتمام سے کی گئی۔اس میں سنگ مرمر، سونا اور رنگ دار اینٹوں کا بھی استعمال ہوا، بیس دروازے کھولے گئے اور مسجد کے چاروں کونوں پر مینار بنائے گئے۔

● مہدی عباسی کے دور خلافت (۱۶۱ھ/۷۷۷ء) کی توسیع اس طور پر ہے کہ جانب شمال اضافہ کیا گیا، مہدی نے مسجد نبوی کے آس پاس کے کچھ گھر خرید کر مسجد کے احاطے میں شامل کر لیے ان میں حضرت عبد الرحمٰن بن عوف، حضرت شُرَحْبِیل بن

حسنہ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے گھر شامل ہیں۔

● ۸۸۸ھ/۱۴۸۳ء میں سلطان اشرف قاتیبائی کی بھی توسیع کا ذکر ملتا ہے، لیکن اس کی تفصیل دست یاب نہ ہو سکی۔

● خلیفہ عبد المجید عثمانی کے عہد (۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء) میں مسجد کے فرش پر اور دیوار قبلہ کے نصف حصہ پر سنگ مرمر لگایا گیا، گنبدوں پر نقش و نگار بنائے گئے اور روضۂ اقدس پر سفید اور سرخ سنگ مرمر لگایا گیا تا کہ وہ دوسرے گنبدوں سے ممتاز نظر آئے۔ اس تعمیر میں ایک نیا دروازہ باب مجیدی کے نام سے بنایا گیا جو دراصل مسجد کے اندر تھا۔

● شاہ عبد العزیز آل سعود کے دور حکومت (۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء) میں مسجد کے شمال، مشرق اور مغرب کے علاقے خرید کر مسجد میں شامل کیے گئے۔ اب مسجد کی کل پیائش ۱۶۳۲۶/مربع میٹر ہوگئی۔

● شاہ فہد بن عبد العزیز کے دور حکومت (۱۴۰۶-۱۶ھ/۱۹۸۵-۹۵ء) میں توسیع کچھ اس طرح ہوئی کہ بیرونی دیوار پر سنگ خارا لگایا گیا، اس توسیع میں چھ نئے مینار بنائے گئے، زمینی منزل کی پیائش ۸۲۰۰۰ مربع میٹر ہے، اس میں ۲۱۰۴ ستون ہیں جو ۶×۶ میٹر کے دالان بناتے ہیں، اور جگہ چھت گنبد کی صورت میں ہے وہاں ۱۸×۱۸ میٹر کے دالان ہیں، یوں نئی توسیع میں ستائیس دالان ہیں اور ان کی چھت متحرک گنبدوں کی صورت میں ہے تا کہ گنبد ہٹانے سے روشنی اور ہوا حاصل ہو سکے۔ چھت کے اوپر نماز کی ادائگی کے لیے وسیع صحن بنائے گئے ہیں جن کی پیائش ۵۸۲۵۰ مربع میٹر ہے، مکمل چھت کی پیائش ۶۸۰۰۰ مربع میٹر ہے، چھت پر تقریباً ۹۰۰۰۰/ افراد نماز پڑھ سکتے ہیں۔ چھت کے اوپر ۱۱۰۰۰/مربع میٹر جگہ پر برآمدے بنائے گئے ہیں جن کی بلندی ۵ میٹر ہے۔

ماخذ: (۱) سیرت المصطفیٰ، از علامہ عبد المصطفیٰ اعظمی
(۲) اٹلس سیرت نبوی، از ڈاکٹر شوقی ابو خلیل

نمونہ حکائی مضمون: (۲)

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ

نام، ولادت، پرورش:

حضرت خواجہ قطب الدین بخت یار کاکی اوشی علیہ الرحمہ "ماوراء النہر" کے ایک قصبہ "اُوش" میں شب دوشنبہ ۵۸۲ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے سے رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔

جب آپ کی عمر ڈیڑھ سال کی ہوئی تو باپ کا سایۂ شفقت سر سے اٹھ گیا اور مادر مہربان کی آغوش محبت میں پروان چڑھتے رہے۔

تعلیم و تربیت اور بیعت:

جب آپ نے زندگی کی پانچویں منزل میں قدم رکھا تو آپ کو اس وقت کے صاحب کمال معلم حضرت ابو حفص قدس سرہ کی درس گاہ میں بٹھا دیا گیا۔ آپ نے اس درس گاہ سے قرآن و سنت اور آداب شریعت و طریقت کی تعلیم پائی۔ اساتذہ کے فیض تربیت نے سلوک و معرفت کا ایسا ذوق پیدا کر دیا کہ ہمہ وقت یاد الٰہی میں مصروف رہنے لگے۔ جب باطنی علوم کی تکمیل کا شوق بڑھا تو آپ مرشد کامل کی تلاش و جستجو میں "اوش" سے نکل کر "اصفہان" پہنچے، ان دنوں حضرت خواجہ معین الدین چشتی سجزی "اصفہان" میں موجود تھے، وہیں حضرت قطب صاحب کو آپ نے شرف ارادت بخشا۔ مرشد کامل سے وابستہ ہو جانے کے بعد آپ نے شیخ کی ہم رکابی میں اسلامی بلاد و امصار کے سفر کیے، بغداد اور حرمین شریفین کی زیارت سے مستفیض ہوئے اور شیخ کی توجہ سے مدارج سلوک طے کرنے لگے، دوران سیر و سیاحت مردان حق آگاہ کی زیارت اور ان کے ارشادات و تعلیمات سے بہرہ مند ہوئے، حضرت نے دو سال کی مدت میں تمام مراحل سلوک طے کر لیے، اس کے بعد مرشد گرامی نے شہر بغداد میں خواجہ ابو اللیث سمرقندی کی مسجد میں سلسلۂ چشتیہ کی خلافت عطا فرمائی۔ حضرت خواجہ

غریب نواز جب بغداد سے روانہ ہوئے تو حضرت قطب آپ کے ساتھ رہے، چشت، ہرات، سبزوار، لاہور اور سمانا کی سیر کرتے ہوئے دہلی وارد ہوئے۔

ارشاد و تبلیغ:

مرشد برحق نے اپنے چہیتے خلیفہ کو ارشاد و تبلیغ کے لیے دہلی ہی میں چھوڑ دیا اور خود اجمیر شریف چلے گئے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات دہلی میں مرجع خلائق بن گئی، علما، صوفیہ اور عام لوگ آپ کے روحانی فیوض و برکات سے مستفیض ہونے کے لیے آستانہ بوسی کیا کرتے۔ مجاہدہ و ریاضت اور ذکر الٰہی کے ساتھ شمالی ہند کی نومولود اسلامی ریاست کی راجدھانی میں حضرت خواجہ غریب نواز کے مشن کی ترویج و اشاعت کے لیے ہمہ تن مصروف ہو گئے، جلیل القدر علما و مشائخ عقیدت کیش بنے اور حضرت کی زیارت کو اپنا معمول بنالیا۔

شمس الدین التمش کی عقیدت:

سلطان دہلی التمش نے آپ کی جناب سے رشتۂ ارادت استوار کیا اور کاروبار سلطنت کی گونا گوں مصروفیات کے باوجود ہفتہ میں دوبار بارگاہ قطب میں حاضر ہوتا۔ التمش کی ارادت و عقیدت کے باوجود حضرت نے کبھی شاہی دربار سے کوئی ربط وضبط قائم نہ رکھا۔ عہدے، جاگیریں اور شاہی تحائف کبھی قبول نہ فرمائے، اس بے نیازی کو دیکھ کر دہلی کے صاحبان جاہ وحشمت اور اکابر دین وملت آستانۂ قطب پر طالب دعا ہوتے اور فیض روحانی کی بھیک مانگنے کے لیے شب و روز حاضر رہتے۔

عطائے جانشینی:

حضرت خواجہ قطب مرشد برحق کے شوق دیدار سے بے قرار ہو کر بہ اجازت مرشد اجمیر شریف پہنچے اور قدم بوسی کی سعادت حاصل کی، جب واپسی کا وقت آیا تو حضرت خواجہ غریب نواز نے شیخ علی سجزی سے فرمان خلافت و جانشینی تحریر کرایا اور قطب

صاحب کے حوالے فرمایا، دستار و کلاہ اپنے دست مبارک سے سر پر رکھی پھر خواجگان چشت کے تبرکات عطا فرمائے، قطب صاحب نے دوگانۂ شکر ادا کیا۔ حضرت خواجہ غریب نواز نے فرمایا: میں نے تم کو خدا کے سپرد کیا اور مقام عزت و بزرگی پر فائز کیا۔ اس طرح خانوادۂ چشت کا سجادہ نشین بنا کر دہلی کی سمت روانہ فرمایا۔

اجمیر سے واپسی کے بیس روز بعد حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو گیا۔ دہلی آ کر حضرت قطب صاحب ارشاد و تبلیغ کے کام میں مشغول ہو گئے اور مشعل چشتیت کی ضیا پاشیوں سے سرزمین ہند کو منور فرماتے رہے۔

وفات اور نماز جنازہ:

حضرت قطب نے اپنی وفات سے قبل حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت و سجادگی عطا فرمائی اور ۱۴ ربیع الاول ۶۳۴ھ کو دوشنبہ کی شب میں جان، جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

سلطان شمس الدین التمش نے نماز جنازہ پڑھائی اور اس ولایت کے گوہر نایاب کو ہمیشہ کے لیے سپرد خاک کر دیا گیا۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

مرقد انور دہلی قدیم میں مرجع خلائق ہے۔

نمونہ فکری مضمون: (۳)

بے چاری اردو

''صحافت'' موجودہ دور کا ایک نہایت طاقتور، موثر اور ہمہ گیر ذریعۂ ابلاغ ہے۔ دور اندیش اور تعلیم یافتہ اقوام اس کی مدد سے زندگی کے مختلف میدانوں میں حیرت انگیز کامیابیوں سے ہم کنار ہو رہی ہیں۔ ذہنوں کی تعمیر یا تخریب میں اس کا زبردست کردار ارباب فکر و نظر کے نزدیک ایک مسلمہ حقیقت سے کم نہیں۔

ہندوستانی صحافت کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو انگریزی اور ہندی دونوں

زبانوں کو پورے ملک کی سبھی زبانوں پر تفوق و برتری حاصل ہے۔ جس کے بہت سارے اسباب ہیں۔ مثلاً انگریزی ایک بین الاقوامی ترقی یافتہ زبان ہے۔ اور ساتھ ہی ہندوستان پر ایک طویل مدت تک انگریزوں کی حکومت کی وجہ سے ہندوستانی قوم اب بھی اس کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہے۔ اس لیے یہاں انگریزی صحافت دوسری سبھی زبانوں کی صحافت پر بھاری ہے۔ جب کہ دوسرے نمبر پر ہندی صحافت اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ کیوں کہ اسے ''راشٹر بھاشا'' کے طور پر قانونی تحفظ کے ساتھ ساتھ فروغ واستحکام کے جملہ حقوق آزادی ہند کے بعد ہی سے حاصل ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی تقویت کے لیے ''ہندی ہندو ہندوستان'' کا نعرہ بھی جذباتی وابستگی کا دائرہ وسیع کرتا جا رہا ہے۔ ہندوستان کی دیگر ایک درجن قومی زبانیں جن میں اردو بھی شامل ہے۔ ان کے اخبارات ورسائل بھی اپنے اپنے حلقوں میں خاصی حد تک رائج و مقبول ہیں اور اپنے وسائل کے اعتبار سے ان کے اثرات بھی ہیں۔

تاہم اردو زبان جسے اگر ''بے چاری اردو'' کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ اس کی صحافت نہایت کس مپرسی اور بے بسی کی کیفیت سے دوچار ہے۔ تقریباً نوے فیصد اردو اخبارات ورسائل اور صحف ومجلّات کا حال ناگفتہ بہ ہے۔ جس کے دو اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔

پہلا سبب یہ ہے کہ اردو کے قارئین خریدنے کے بجائے مانگ کر پڑھنے کے عادی ہیں۔ کسی ایک انجمن، لائبریری، یا چائے خانے میں ایک اردو اخبار یا رسالہ آجائے تو وہ پورے محلّہ والوں کے لیے کافی ہوتا ہے۔ جب تک اس کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں اور اس کی صورت مسخ نہ ہو جائے اس وقت تک اس کا مطالعہ جاری رہتا ہے۔ الگ الگ خرید کر پڑھنے کی توفیق بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ اسے گورنمنٹ کے یا پرائیوٹ کمپنیوں کے مناسب اشتہار بھی نہیں مل پاتے جب کہ اشتہارات ہی کسی اخبار یا رسالے کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں اور انھیں کے ذریعے کچھ منافع بھی حاصل ہو پاتا ہے۔

اس طرح قوت خرید کی کمی اور اشتہارات کے عدم حصول نے ان کی کمر توڑ رکھی ہے۔ کہیں سے کوئی اشتہار ملا بھی تو کئی چکر لگانے کے بعد اور اس کا ریٹ بھی انگریزی و ہندی کے مقابلہ میں نہایت معمولی ہوتا ہے۔

اشتہارات نہ ملنے کی وجہ تو وہ عصبیت ہے جو ہر شعبہ زندگی میں مسلمانوں کا تعاقب کر رہی ہے۔ اردو کو چوں کہ عام طور پر مسلمانوں کی (اور بعض انتہا پسندوں کے خیال کے مطابق حملہ آوروں کی) زبان سمجھا جاتا ہے اس لیے اس کے ساتھ بھی سوتیلا سلوک برتا جاتا ہے۔ البتہ قوت خرید جو محبان اردو کا اپنا معاملہ ہے اس کی کمی اور کمزوری ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ کیوں کہ ہماری قوم کے افراد گھریلو اخراجات میں بیشتر اوقات فضول خرچی اور نمائش و آرائش کا جو مظاہرہ کرتے ہیں وہ ہماری نظر کے سامنے ہے۔ شادی بیاہ کے مواقع پر ان کی دولت جس طرح بے دریغ لٹتی ہے اس کا حال سب پر عیاں ہے۔ بازار میں چائے، پان وغیرہ پر ان کا جو یومیہ خرچ ہوتا ہے اس کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں ۔ لیکن کسی اردو اخبار و رسالہ کے خریدنے کی بات بھی ان کے سامنے آجائے تو ان کی کفایت شعاری اور احتیاط پسندی یا بخل و بے زاری کا منظر دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔

(نقوش فکر، ص: ۲۶۳، ۲۶۲۔ از مولانا یٰس اختر مصباحی)

یہاں نمونے کے طور پر چند مضامین کے اشارے لکھے گئے ہیں مضمون شروع کرنے سے پہلے آپ بھی موضوع کے اعتبار سے چند ضروری اشارے لکھ لیجیے اور ان اشارات کو تھوڑا تھوڑا بڑھایئے تو ایک مختصر سا مضمون تیار ہو جائے گا۔

① جانوروں کی بابت:۔ (۱) قسم (۲) جسم کے حصے اور ان کی خصوصیات۔ (۳) عادات (۴) خوراک (۵) رہائش (۶) فوائد و نقصانات۔

② موسموں کے متعلق:۔ (۱) تمہید (۲) وقت (۳) خصوصیات (۴) نباتات اور انسانوں پر موسم کا اثر (۵) فوائد و نقصانات (۶) عام رائے۔

③ سائنسی ایجادات کے لیے:۔ (۱) تمہید (۲) عوام میں اس ایجاد کا استعمال (۳) موجد (۴) اس کی ایجاد سے پہلے کا طریقہ کار (۵) فوائد ونقصانات (۶) عام اثر

④ کھیلوں کے متعلق:۔ (۱) تمہید (۲) اس کھیل کی ایجاد کب اور کہاں ہوئی (۳) کھیلنے والوں کی تعداد (۴) کھیل کے سامان (۵) کھیل کا طریقہ اور جگہ (۶) صحت پر اثر (۷) کھیل کی مقبولیت (۸) فوائد ونقصانات

⑤ کسی شخص سے متعلق:۔ (۱) تمہید (۲) نام، ولدیت اور خاندان (۳) مقامِ پیدائش، تاریخ پیدائش (۴) تعلیم وتربیت (۵) اہم کارنامے (۶) اس کی ذات سے ملک یا سوسائٹی کو فائدہ (۷) عادات (۸) وفات (۹) یادگار

⑥ تہوار کے لیے:۔ (۱) کس قوم کا اور کس نوعیت کا تہوار ہے یعنی مذہبی، سماجی یا قومی (۲) کب منایا جاتا ہے (۳) کیوں منایا جاتا ہے (۴) کس طرح منایا جاتا ہے (۵) اس کے اچھے اور برے پہلو (۶) برے پہلوؤں کی اصلاح کا طریقہ۔

انتخاب عنوان

مضمون نگاری کے سلسلے میں پہلا مرحلہ انتخاب عنوان کا ہوتا ہے۔ عنوان کا انتخاب کرتے وقت درج ذیل باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

(۱) عنوان پسندیدہ ہو (۲) موضوع سے واقفیت ہو (۳) موضوع سے متعلق کچھ جملے ذہن میں موجود ہوں (۴) عنوان ایسا ہو کہ اس پر آسانی کے ساتھ اظہار رائے کیا جا سکے۔

خاکے کی تیاری

انتخاب عنوان کے بعد خاکے کی تیاری کا نمبر آتا ہے۔ تمہید، نفس مضمون اور اختتامیہ میں جو چیزیں تحریر کرنی ہیں پہلے ہی سے طے کر لی جائیں تو آسانی ہوگی اور مضمون میں ایک طرح کا ربط اور تسلسل قائم رہے گا۔ مثلاً: مضمون ”کتب بینی“ اور ”طالب علم“ کا خاکہ اس طرح تیار کیا جا سکتا ہے:

(۱) کتب بینی

تمہید: (۱) کتب بینی کی اہمیت۔

نفسِ مضمون: (۲) کتب بینی کے فائدے (۳) کتب بینی کا طریقہ (۴) اخلاق سنوارنے والی کتابوں کا مطالعہ (۵) فحش کتابوں سے پرہیز (۶) ماتحتوں کو کتب بینی کی ترغیب

اختتامیہ: اخلاق سنوارنے والی کتابوں کی طرف رغبت اور اخلاق کش کتابوں سے پرہیز۔

(۲) طالب علم

تمہید: (۱) طلب علم کی ضرورت اور اہمیت۔

نفسِ مضمون: (۲) زندگی کے تمام شعبوں میں علم کی ضرورت۔

(۳) جہالت انسان کی بہت بری صفت ہے (۴) طالب علم کا مرتبہ (۵) دین اور دنیا میں علم کے فوائد (۶) وہ صفات جو طالب علم کے اندر نکھار پیدا کرتی ہیں۔

اختتامیہ: سیرت و کردار کی درستی اور بدعملی سے اجتناب میں علم کا کردار۔

نمونے کے طور پر یہ خاکے پیش کیے گئے ہیں، اس کی پابندی آپ پر لازم نہیں۔ آپ اپنے طور پر اس سے بہتر خاکے تیار کرسکتے ہیں۔

مشقی کام

① مضمون ''عید الفطر'' کے لیے چند اشارے لکھے جا رہے ہیں۔ آپ مزید اشارے لکھ کر خاکہ مکمل کیجیے۔

تمہید: مسلمان اور دوسری قوموں کے تہوار

نفسِ مضمون: عید الفطر کیا ہے۔ عید کا چاند دیکھنا۔ چاند رات کی مصروفیات اور خوشیاں۔ نماز عید کی تیاری۔

● .... ● ....

● .... ● ....

اختتام: ● ....

(۲) مضمون "نظافت کے فائدے" کے لیے نفس مضمون کے اشارے لکھے جا رہے ہیں، آپ تمہید اور اختتامیہ لکھ کر خاکہ مکمل کیجیے۔

تمہید: ● ....

....

نفس مضمون: نظافت کے طریقے۔ جسم اور لباس پر نظافت کا اثر۔ غذا اور پانی میں نظافت کے فوائد۔ قریات وقصبات کی نظافت۔ مدارس میں نظافت۔ اسلام میں نظافت کی اہمیت۔

اختتامیہ: ● ....

....

(۳) درج ذیل عنوانات پر مضمون کے خاکے تیار کیجیے۔

(۱) الیکشن کا دور۔ (۲) تاریخی عمارت کی سیر۔

(۳) برسات کی رات۔ (۴) جلسۂ تقسیم انعامات۔

مضمون کیسے پھیلائیں

آپ جب کوئی عبارت لکھیں تو اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ ایک جملے کا دوسرے جملے سے ربط ہو اور ان کے درمیان مناسبت بھی پائی جائے۔ ترتیب عمدہ، آسان اور معقول ہو اور پورے مضمون میں یکسانی پائی جائے، جیسے ایک جملہ ہے:

"رمضان خیر و برکت والا مہینہ ہے"

اس عبارت کو پھیلانا چاہیں تو یہ صورت اختیار کریں گے:

(۱) رمضان خیر و برکت والا مہینہ ہے۔ (۲) اس مبارک مہینے میں کوئی بھی عملِ مستحب فرض کے برابر ہوتا ہے۔ (۳) اور فرض ستر فرض کے برابر۔ (۴) رسول کریم

صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے اس مہینے کو تین حصوں میں تقسیم فرما کر ارشاد فرمایا: اس کے پہلے دس دن رحمت نازل ہونے کے ہیں، دوسرے دس دن گناہوں سے بخشش کے ہیں اور تیسرے دس یا نو دن جہنم سے آزادی کے ہیں۔

اسے مزید پھیلائیں تو یہ شکل ہوگی:

(۱) رمضان المبارک نہایت خیر و برکت والا مہینہ ہے۔ (۲) اس ماہ مبارک میں کوئی عملِ مستحب فرض کے برابر ہوتا ہے (۳) اور ایک فرض ستر فرض کے برابر (۴) رسول کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے اس مہینے کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ارشاد فرمایا: اس کے پہلے دس دن رحمت نازل ہونے کے ہیں، دوسرے دس دن گناہوں سے بخشش کے ہیں اور تیسرے دس یا نو دن جہنم سے آزادی کے ہیں (۵) اس بابرکت مہینے کے دنوں کی عظیم عبادت روزہ ہے جو بلا شبہہ خدا کی لا زوال نعمت ورحمت ہے (۶) اس نعمت سے بھرپور فائدہ اٹھانے والا مسلمان بڑا خوش نصیب ہے (۷) اور اس کی برکتوں سے محروم رہنے والا بڑا ہی بدنصیب ہے (۸) رمضان میں روزہ رکھنے کی اتنی اہمیت اور اتنا عظیم ثواب ہے کہ غیر رمضان میں متواتر گیارہ مہینے روزہ رکھنے سے وہ ثواب اور مرتبہ نہیں ملتا (۹) یہ مہینہ تو ہر پل رحمتیں اور برکتیں بانٹتا ہے، اب ہم اس کی عظمتوں کا احساس ہی نہ کریں تو یہ ہماری حرماں نصیبی ہے، رمضان کا کوئی قصور نہیں (۱۰) جس طرح بدن کی صفائی کے لیے غسل کرنا ضروری ہے اسی طرح رمضان کی برکتیں حاصل کرنے کے لیے اس کے دن میں روزہ رکھنا اور رات میں تراویح پڑھنا ضروری ہے۔ (۱۱) اس کے بغیر کوئی مسلمان رمضان المبارک کی لذتوں سے آشنا نہیں ہوسکتا۔ (۱۲) اور جو اتنی بھی تکلیف نہ برداشت کر سکے اسے رمضان کی برکتوں اور سحر وافطار کی لذتوں سے بھی امید رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ (۱۳) اس ماہ مبارک کے آخری عشرے میں رب کریم نے ایک ایسی رات بنائی ہے جو ہزار راتوں سے بہتر ہے (۱۴) اس رات میں عبادت کر کے بندہ ہزار راتوں کی

عبادت کا ثواب حاصل کر سکتا ہے۔ (۱۵) اس مبارک رات کا نام رب العزت نے "لیلۃ القدر" رکھا ہے یعنی عظمت و بلندی والی رات۔ اسے ہم "شب قدر" کے نام سے جانتے ہیں۔

☆ مذکورہ بالا مثال میں چند جملوں اور عبارتوں کو جوڑ کر ایک مختصر سے مضمون کی شکل دے دی گئی ہے۔ اسی طرح جو بھی موضوع اختیار کیا جائے اس کے عناصر مناسب ترتیب اور آسان لفظوں میں تحریر کرنا چاہیے۔ ایک مثال اور دیکھیے، موضوع ہے:

"قرآن کریم اللہ تبارک وتعالی کی کتاب ہے"

اس جملے کو آپ اس کے عناصر اور متعلقات کے ساتھ یوں پھیلا سکتے ہیں:

(۱) قرآن کریم اللہ تبارک وتعالی کی کتاب ہے (۲) رب کریم نے پہلے اسے لوح محفوظ میں رکھا (۳) پھر بیت العزت کی طرف نازل فرمایا (۴) اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ اپنے محبوب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم پر نازل فرمایا (۵) یہ کتاب انسانوں کی ہدایت اور رہ نمائی کے لیے خدائی منشور ہے (۶) یہ ہمیشہ ہمارے درمیان کتاب ہدایت اور نور مبین کی صورت میں موجود رہے گی (۷) قرآن مجید سے پہلے جتنی کتابیں نازل ہوئیں ان کی دعوت ایک محدود زمانے اور خاص قوم کے لیے تھی (۸) لیکن قرآن حکیم کی دعوت پوری دنیا میں بسنے والی قوموں کے لیے ہے اور تا قیامت رہے گی۔

اس کو آپ اور وسعت دینا چاہیں تو لکھ سکتے ہیں:

(۱) قرآن کریم اللہ تبارک وتعالی کی مقدس کتاب ہے (۲) رب کریم نے پہلے اسے لوح محفوظ میں رکھا (۳) پھر بیت العزت کی طرف نازل فرمایا (۴) اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ اپنے محبوب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم پر حسب ضرورت تھوڑا تھوڑا نازل فرمایا (۵) یہ کتاب انسانوں کی ہدایت

اور رہ نمائی کے لیے خدائی منشور ہے (۶) یہ ہمیشہ ہمارے درمیان کتاب ہدایت اور نور مبین کی صورت میں موجود رہے گی (۷) قرآن مجید سے پہلے جتنی کتابیں اور صحیفے انبیاے کرام پر نازل ہوئے ان کی دعوت ایک محدود زمانے اور خاص قوم کے لیے تھی (۸) لیکن قرآن کی دعوت پوری دنیا میں بسنے والی قوموں کے لیے ہے اور قیامت تک رہے گی (۹) قرآن کے آنے سے پہلے تو ہم پرستی، گمراہی اور اخلاقی پستی عام تھی (۱۰) ایک مالک حقیقی کو بندوں نے بھلا دیا تھا (۱۱) بت پرستی عرب کا شعار تھا (۱۲) یہیں تک بس نہیں بلکہ جابر و ظالم بادشاہوں کی سجدہ ریزی باعث افتخار سمجھی جاتی تھی (۱۳) ایسے تاریک ماحول میں پاک پروردگار نے اپنے حبیب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو کتاب ہدایت دے کر ان کی اصلاح کے لیے بھیجا (۱۴) قرآن نے آکر حقیقت کے چہرے سے گم رہی کی دبیز چادر ہٹادی (۱۵) اور صاف صاف بتادیا کہ یہ مٹی کے بت تمھارے خدا نہیں (۱۶) اور یہ ظالم و جابر بادشاہ تمھارے معبود نہیں (۱۷) تمھارا معبود وہ معبود حقیقی ہے جس نے زمین، آسمان، چاند، سورج اور ساری مخلوق کو ایک لفظ ''کن'' سے پیدا کیا (۱۸) اے لوگو! اسی کی بارگاہ میں سر جھکاؤ اور کفر و شرک کی غلاظت سے دور رہو (۱۹) قرآن کریم نے اخلاق و مروت کی تعلیم دے کر انسان کا معیار بلند کیا (۲۰) سود حرام کر کے عام انسانوں خصوصاً غریبوں پر رحم کیا (۲۱) زمانۂ جہالت کی سختی اور ناروا سلوک سے عورتوں کو نجات دی (۲۲) مملوک قوموں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی (۲۴) یتیموں اور بیواؤں کی محبت و مودت کا درس دیا (۲۵) پڑوسیوں کے ساتھ رحم دلی اور بھائی چارہ کی تاکید فرمائی (۲۶) گویا کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں قرآن مجید رہ نما اصول ہے (۲۷) اس کے بتائے ہوئے ضابطے پر انسان عمل پیرا ہو کر اپنی دنیوی اور اخروی زندگی خوش گوار بنا سکتا ہے (۲۹) اور اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سرخ روئی حاصل کر سکتا ہے۔

مضمون نگاری کی مشق

مشق کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے دیا ہوا موضوع خوب اچھی طرح سمجھ لیا جائے کہ اس موضوع کے تحت کون کون سی چیزیں آسکتی ہیں۔ اس کی روشنی میں مرکزی عنوان کے خاکے بنالیں پھر اسے پھیلانا شروع کریں تاکہ ایک مضمون کی شکل ہو جائے۔

مضمون تمہیدی کلمات سے شروع کریں اور نفس مضمون پر گفتگو کے بعد اختتامیہ کی عبارت پر ختم کریں اس طرح مضمون پُرکشش ہوگا اور افادہ سے بھرپور بھی۔

یہاں چند عنوانات ان کی ذیلی سرخیوں کے ساتھ لکھے جارہے ہیں۔ آپ ان سرخیوں پر تھوڑی تھوڑی روشنی ڈالتے جائیں تو ان شاءاللہ ایک اچھا مضمون تیار ہو سکتا ہے۔ ان مجوزہ سرخیوں کی پابندی آپ پر لازم نہیں، مضمون کے اندر حسن پیدا کرنے کے لیے ان میں کمی، بیشی اور تبدیلی ہو سکتی ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ مرکزی عنوان کی روح ختم نہ ہو۔

مشق ①

عنوان: مسجد

تمہید: (۱) تعمیر مسجد کا مقصد۔

نفس مضمون: (۲) مسجد کی فضیلت حدیث کی روشنی میں۔ (۳) مسجد جنت کی کیاری ہے۔ (۴) مسجد میں نماز پڑھنا گھر میں نماز پڑھنے سے درجوں بہتر ہے۔ (۵) مسجد دین کا مرکز ہے، یہاں سے مسلمانوں کو بھلائی کا پیغام دیا جاتا ہے اور برائی سے بچنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ (۶) پنج وقتہ مسجد میں جانے سے آپس میں محبت اور الفت پیدا ہوتی ہے۔

اختتامیہ: افسوس کہ مسلمانوں نے مسجد سے دوری اختیار کر لی ہے اور اس کا حق فراموش کر دیا ہے۔ اس بے راہ روی سے ہٹ کر ہمیں مسجدوں کو آباد کرنا چاہیے اس میں اللہ کی خوشنودی اور اس کے رسول کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

مشق ②

عنوان: مدرسہ

تمہید: (۱) علم کی اہمیت اور فضیلت (۲) اہل علم کی عزت اور اس کا مرتبہ۔

نفسِ مضمون: (۳) اس وقت علمِ دین حاصل کرنے کا واحد ذریعہ مدرسہ ہے۔ (۴) مدرسہ میں بچوں کی اسلامی تربیت۔ (۵) مختلف علما سے استفادے کا انتظام۔ (۶) مدرسہ کی لائبریری سے استفادے کا موقع۔ (۷) طلبہ کی انجمنوں سے سیکھنے، سکھانے کی مشق۔ (۸) آج کے مغربیت زدہ دور میں مدارس کی اہمیت۔

اختتامیہ: (۹) بچوں کی تعلیم و تربیت میں مدارس کا کردار۔ (۱۰) مدارس سے قربت کے فوائد۔

مشق ③

عنوان: عیدالفطر

تمہید: (۱) عیدالفطر کیا ہے۔

نفسِ مضمون: (۲) رمضان اور عیدالفطر کا تعلق (۳) عید کی تیاریوں کا منظر (۴) چاندرات کی خوشیاں اور مصروفیات (۵) عید کی صبح غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر عید گاہ کی طرف جانا (۶) نمازِ عید ادا کرنا (۷) نماز کے بعد گھر کی واپسی اور بچوں کے لیے ان کے ذوق کی چیزیں خریدنا (۸) احباب اور اقربا کی سوئیوں سے ضیافت وغیرہ (۹) عید کے دن کرنے کے کام (۱۰) خرافات سے بچنے کا جذبہ۔

اختتامیہ: اللہ تعالیٰ ہمیں شرعی عید منانے کی توفیق عطا فرمائے اور غیر شرعی امور سے بچائے۔

مشق ④

عنوان: بارش کا فائدہ اور نقصان

تمہید: (۱) بارش سے پہلے فضا کی کیفیت۔ بارش کے آثار۔

نفسِ مضمون: (۲) بارش کا نزول۔ سڑکوں اور راستوں کی حالت۔ لوگوں کا حال۔ بارش کے بعد کی فضا۔ (۳) **فائدے:** دریاؤں اور تالابوں کا بھر جانا۔ کھیتی کا سیراب ہونا اور نباتات کا اگنا۔ فضا کا غبار اور جراثیم سے پاک ہونا۔ (۴) **نقصان:** کام کا بند ہو جانا۔ بعض گھروں کا منہدم ہونا۔ نقل و حرکت کے وسائل بند ہونا۔

اختتامیہ: (۵) بارش کے فوائد پر اللہ کا شکر اور نقصان سے بچنے کی دعا۔

مشق ⑤

عنوان: لائبریری کے فوائد

تمہید: (۱) لائبریری کی ضرورت

نفسِ مضمون: (۲) لائبریری کی تعریف (۳) لائبریری کی قسمیں (اسکول اور کالج کی لائبریری، عوامی لائبریری، ذاتی لائبریری) (۴) لائبریریوں میں پڑھنے اور کتابیں جاری کرانے کے اصول۔ (۵) مختلف موضوعات پر کتابوں کی موجودگی۔ (۶) لائبریری میں مطالعہ کے فائدے۔

اختتام: لائبریری سے استفادے کی ترغیب اور بے تعلقی سے نقصان کا ذکر۔

مشق ⑥

عنوان: والدین کا ادب

تمہید: (۱) مذہب اسلام میں بڑوں کے ادب کی فضیلت واہمیت

نفسِ مضمون: (۲) والدین کا مرتبہ اور ان کا ادب واحترام (۳) ادب کے طریقے (۴) ان کی نافرمانی اور بے ادبی سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ (۵) وہ اولاد کے لیے طرح طرح کی مشقتیں جھیلتے ہیں، خصوصاً ماں۔ (۶) والدین کو خوش رکھنا اور ان کی ناراضی سے بچنا نیک اولاد کی نشانی ہے۔

اختتامیہ: (۷) والدین اللہ تعالیٰ کی جانب سے اولاد کے لیے نعمت ہیں، وہ جنت کا بھی سبب ہیں اور دوزخ کا بھی۔

مشق ⑦

عنوان: الیکشن کا منظر

تمہید: (۱) الیکشن کا معنیٰ و مطلب (۲) جمہوری ملک میں حکومت سازی کے لیے الیکشن کی ضرورت۔

نفسِ مضمون: (۳) الیکشن کی تیاریاں (۴) امیدواروں کا اپنے حلقۂ انتخاب میں جا کر ماحول ساز گار کرنا (۵) الیکشن کے دن کا منظر (عوام کی بھاگ دوڑ۔ مختلف پارٹیوں کے خیموں میں آمد و رفت۔ پولنگ بوتھ، حفاظتی انتظام کا ذکر اور ووٹ ڈالنے کا منظر) (۶) الیکشن کے بعد عوام کے پرلطف تبصرے۔

اختتامیہ: (۷) الیکشن کی اہمیت اور ملک کی تعمیر و ترقی میں ووٹ کا کردار۔

مشق ⑧

عنوان: ہجرت مدینہ

تمہید: (۱) ہجرت کیا ہے۔ (۲) ہجرت کے اسباب۔

نفسِ مضمون: (۳) کاشانۂ نبوت کا محاصرہ (۴) آغاز ہجرت (۵) غارِ ثور کا واقعہ (۶) سراقہ کا تعاقب (۷) قبا میں قیام اور مسجد کی بنیاد (۸) مدینہ میں جلوہ گری (۹) اہل مدینہ کی شادمانی۔

اختتامیہ: ہجرت کی وجہ سے مذہب اسلام کا فروغ اور کفار کی ہزیمت۔

مشق ⑨

عنوان: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

تمہید: (۱) رسول کریم (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے وصال کے بعد صحابہ کا حال اور خلیفہ کا انتخاب۔

نفسِ مضمون: (۲) نام و نسب (۳) قبل اسلام کے حالات (۴) قبولِ اسلام (۵) اشاعتِ اسلام (۶) غزوات میں شرکت (۷) خلافت (۸) خلافت کے بعد کے حالات اور کارنامے (۹) وفات (۱۰) بیویاں اور اولاد۔

اختتامیہ: پورے مضمون پر چند سطروں میں تبصرہ

مشق (۱۰)

عنوان: امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

تمہید: (۱) جن عظیم صاحبانِ علم و معرفت نے قرآن و حدیث اور اجماع و قیاس کی روشنی میں مسائل کا استخراج کیا ان میں چار شخصیتیں بہت نمایاں ہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ۔ یہ وہ رجالِ قدسیہ ہیں جن کے مقلدین دنیا کے مختلف گوشوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان ائمہ کرام میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت سب پر فائق ہے۔

نفسِ مضمون: (۲) نام و نسب (۳) ولادت (۴) تعلیم و تربیت (۵) فقاہت (۶) پرہیزگاری (۷) عمل بالحدیث (۸) مجلسِ فقہ (۹) وصال

اختتامیہ: امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے تاعمر دینِ حنیف کی خدمت کی، اس کارِ عظیم کو آگے بڑھانے کے لیے شاگردوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جو اجتہادی صلاحیتوں سے بہرہ ور تھی۔ ان کے ذریعہ حنفیت کی خوب اشاعت ہوئی۔

مشق (۱۱)

عنوان: شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

تمہید: (۱) ہندوستان میں حدیث کی اشاعت اور اس سلسلے میں شیخ کی خدمات۔

نفسِ مضمون: (۲) نام و نسب (۳) ولادت اور نشو و نما (۴) تحصیلِ علم (۵) سفرِ حجاز (۶) درس و تدریس (۷) تصنیف (۸) بیعت (۹) ہندوستان میں علم

حدیث کا فروغ (۱۰) وصال (۱۱) اولاد امجاد

اختتامیہ: اللہ تعالی، حضرت شیخ کی خدمات دینی سے فیض یابی کا حوصلہ عطا فرمائے.........وغیرہ وغیرہ۔

مشق (۱۲)

عنوان: حافظ ملت علامہ شاہ عبد العزیز بانی جامعہ اشرفیہ

تمہید: (۱) حافظ ملت علامہ شاہ عبد العزیز علیہ الرحمہ مذہب اسلام کے سچے علم بردار اور قوم کے اصلاح کار تھے، ایک دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے، نیک سیرت والدین کے زیر سایہ نشو ونما پائی، تعلیم و تربیت میں والدین کی کوشش اور نگرانی کا اہم حصہ ہے۔ سچائی، دیانت داری، اخلاق، کردار، ہمت، انسانی ہم دردی اور زہد وتقوی نے آپ کی شخصیت میں اور چار چاند لگا دیے۔ ان ہی خصوصیات نے آپ کو بلندی اور عظمت عطا کی۔ ان کی سیرت سے آشنائی ہماری زندگی کے سفر میں ایک عمدہ رہ نما کا کام کرسکتی ہے۔

نفس مضمون: (۲) ولادت (۳) بچپن (۴) ابتدائی تعلیم (۵) اعلی تعلیم (۶) بیعت وخلافت (۷) تدریسی اور تصنیفی خدمات (۸) مبارک پور تشریف آوری (۹) مدرسہ اشرفیہ سے دار العلوم اشرفیہ اور الجامعۃ الاشرفیہ تک (۱۰) سفر حجاز (۱۱) سفر آخرت

اختتامیہ: اللہ تعالی حافظ ملت کا علمی وروحانی فیضان عام فرمائے اور ان کی عظیم یادگار الجامعۃ الاشرفیہ کو ہر لمحہ فروغ واستحکام بخشے۔

مشق (۱۳)

عنوان: میرا جامعہ

تمہید: (۱) جامعہ کا معنی ومطلب۔ جامعہ کی شہرت کا سبب۔

نفس مضمون: (۲) جامعہ کے شعبہ جات (۳) متعدد عمارتیں۔ (۴)

لائبریری اور دار المطالعہ کا اہتمام (۵) خورد و نوش کا انتظام (۶) تفریح اور کھیل کے مواقع (۷) اساتذہ کی شفقت و مہربانی (۸) تعلیمی اور اصلاحی تقریبات کا اہتمام (۹)

اختتامیہ: عمدہ تعلیم و تربیت اور دل چسپی کے مناسب اسباب کی وجہ سے طلبہ کی شخصیت سازی پر بہترین اثر۔

مشق ⑭

عنوان: یوم جمہوریہ

تمہید: (۱) ملک میں منعقد ہونے والی مختلف تقریبات کا ذکر۔

نفس مضمون: (۳) جمہوریہ اور یوم جمہوریہ کا معنی و مطلب (۴) اپنے مدرسہ میں یوم جمہوریہ کی تقریبات کا آنکھوں دیکھا حال:

(الف) آغاز بزم (ب) طلبہ کا مختلف قسم کے پروگرام پیش کرنا (ج) اساتذہ کی شرکت (د) تقسیم انعامات (ہ) ناظم مدرسہ کی تقریر کا خلاصہ۔

اختتامیہ: پورے مضمون کا نچوڑ

مشق ⑮

عنوان: بس کا ایک سفر

تمہید: (۱) دوران سفر کی دشواریاں

نفس مضمون: (۲) ایک طویل انتظار کے بعد بس کی آمد (۳) ازدحام کی وجہ سے بس پر چڑھنے میں دشواری۔ (۴) کھڑے کھڑے راستہ طے کرنا (۵) انتظار شدید کے بعد سیٹ کا ملنا (۶) روپیہ چوری ہو جانا (۷) ٹکٹ خریدنے میں دشواریاں (۸) اس سفر کی دوسری پریشانیاں۔ (۹) ایک ہم درد شخص کی مدد سے آسانیاں ملنا۔

اختتامیہ: (۱۰) دونوں کے درمیان دوستانہ تعلق قائم ہونا۔

مشق ⑯

عنوان: ہمارے ادارے کا نظامِ امتحان

تمہید: (۱) امتحان کی ضرورت اور تعلیم پر اس کا اثر

نفسِ مضمون: (۲) امتحان کی اطلاع اور نظام الاوقات کی تفصیل (۳) نشست گاہوں کی ترتیب (۴) نگرانِ امتحان کی تن دہی (۵) نقل کرنے والوں کے ساتھ برتاؤ (۶) پاس، فیل کا فی صد (۷) نتیجہ کی برآمدگی (۸) اعلیٰ نمبر سے پاس ہونے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے انعام کی تقسیم۔

اختتامیہ: دل جمعی سے تحصیلِ علم کی لگن اور اچھے نمبر لانے کی فکر۔

مشق ⑰

عنوان: اخبار بینی کے فوائد

تمہید: (۱) اخبار کا معنی و مطلب۔

نفسِ مضمون: (۲) اخبار کے اثرات (۳) گرد و پیش اور بیرونی ممالک کے واقعات کی خبر دینا (۴) صنعت و حرفت میں ترقی کا سبب (۵) ادب کے فروغ میں اخبارات کا حصہ (۶) میدانِ سیاست میں اخبار کی اہمیت (۷) ذہنی تفریح کا ایک سامان (۸) اخبار اور خدمتِ خلق (۹) رائج اخباروں کے مضر اثرات۔

اختتامیہ: (۱۰) اخبار کے کچھ نقصان دہ پہلوؤں کے باوجود اس کی افادیت تسلیم شدہ...وغیرہ وغیرہ۔

مشق ⑱

عنوان: محنت کی برکت

تمہید: (۱) محنت کیا ہے۔

نفسِ مضمون: (۲) محنت سے زندگی کی رونق ہے (۳) محنت کی بدولت انسان ترقی کی منزلیں طے کر لیتا ہے (۴) محنت ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے (۵) محنتی آدمی قابل

تعریف ہوتا ہے (۶) کاہل آدمی معاشرے کا بدنما داغ ہے (۷) فطرت اور محنت۔

اختتامیہ: (۸) محنت کے بغیر انسان ناقص ہے اور اس کی زندگی بے مقصد ہے۔

مشق ⑲

عنوان: وقت کی قیمت

تمہید: (۱) انسان کا ایک نظام اوقات کے مطابق زندگی بسر کرنا اس کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

نفس مضمون: (۲) موجودہ وقت بیش قیمت ہے (۳) وقت کا صحیح استعمال (۴) ضیاع وقت سے پرہیز (۵) وقت صرف کرنے کے اصول (۶) ہر منٹ اہمیت کا حامل ہے (۷) وقت کا پابند انسان کم وقت میں بہت کچھ کر گزرتا ہے (۸) وقت کی پابندی پر ہر آدمی کی کامیابی منحصر ہے (۹) وقت برباد کرنے سے کام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

اختتامیہ: (۱۰) وقت کے صحیح استعمال سے آدمی سرخ رو ہوتا ہے اور ترقیاں اس کے قدم چومتی ہیں............

مشق ⑳

عنوان: تعلیم نسواں

تمہید: (۱) تعلیم کی اہمیت و فضیلت

نفس مضمون: (۲) تعلیم کی ضرورت (۳) تعلیم نسواں کا مطلب (۴) تعلیم کا موجودہ غیر مہذب نظام (۵) کون سا طریقۂ تعلیم بہتر ہے (۶) تحصیل علم کے بعد ذمہ داریاں: اسلامی اصولوں پر چلنا۔ والدین کی خدمت کرنا۔ شوہر کا حق ادا کرنا۔ بچوں کی پرورش اسلامی طرز پر کرنا۔ خویش و اقارب اور پاس پڑوس والوں سے خوش اخلاقی سے پیش آنا۔ گویا اپنے پورے گھر کو سلیقہ مندی سے سنبھالنا اور ممکن طریقے سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں حصہ لینا وغیرہ۔

اختتامیہ: تعلیم سے جس طرح مردوں کی شخصیت سنورتی ہے اسی طرح اس سے عورتوں کے اندر بھی نکھار آتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حصول علم کے بعد وہ گھر کی چہار دیواری پھلانگ کر محفلوں کی رونق بنیں۔

مشق ㉑

عنوان: عیدالاضحیٰ

تمہید: (۱) مختلف عیدوں کا تعارف اور عیدالاضحیٰ کا معنی۔

نفس مضمون: (۲) عیدالاضحیٰ کا وقت، مہینہ اور دن کی تعیین کے ساتھ (۳) بڑے، بوڑھوں خصوصاً بچوں کے چہروں پر خوشی کے آثار (۴) نماز کی تیاری اور ادائیگی (۵) قربانی (۶) قربانی کا وقت اور اس کا وجوب (۷) قربانی کس پر واجب ہے (۸) قربانی کے گوشت کا مسئلہ۔

اختتامیہ: (۹) صاحب نصاب ہوتے ہوئے قربانی نہ کرنے پر وعید (۱۰) قربانی کرنے والوں کے لیے اجر وثواب۔

مشق ㉒

عنوان: بیعت رضوان

تمہید: (۱) صلح حدیبیہ کا مختصر تعارف

نفس مضمون: (۲) بیعت کا معنی (۳) بیعت کی ضرورت کیوں پیش آئی (۴) بیعت کس بات پر ہوئی (۵) حضرتِ عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت (۶) اس بیعت کو بیعت رضوان کیوں کہتے ہیں۔

اختتامیہ: بیعت رضوان کے ثمرات

مشق ۴۳

عنوان: حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ

تمہید: (۱)....................

نفس مضمون: (۲) نام ونسب (۳) کچھ خاندانی حالات (۴) قبول اسلام (۵) ہجرت (۶) کن کن غزوات میں شرکت کی (۷) رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کی وفات کے وقت آپ کی حالت (۸) عہد صدیقی میں آپ کی حیثیت (۹) خلافت کیسے عمل میں آئی (۱۰) فتوحات فاروقی (۱۱) شہادت

اختتامیہ: (۱۲) فاروقی نظام حکومت پر ایک مختصر تبصرہ۔

مشق ۴۴

عنوان: حضرت امام مالک رحمۃ اللہ تعالی علیہ

تمہید: (۱)....................

نفس مضمون: (۲) نام ونسب (۳) ولادت (۴) تعلیم وتربیت (۵) مسند درس وافتا (۶) تصانیف (۷) احترام حدیث رسول (صلی اللہ تعالی علیہ وسلم) (۸) احترام مدینہ (۹) وفات

اختتامیہ: (۱۰)................

انتخاب مضامین

مضمون نگاری کے اصول وآداب میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ مضمون میں حسن پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کہنہ مشق اور صاحب اسلوب قلم کاروں کے مضامین بار بار پڑھے جائیں، اس لیے کہ ان کے انداز و بیان سے اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی میں رہ نمائی حاصل ہوگی۔ اسی مقصد کے تحت صاحب طرز اور معتبر قلم کاروں کی تحریروں کا ایک بہترین انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) سنت ابراہیمی

الٰہی عظمتوں اور خدائی رفعتوں کے سامنے سر نیاز جھکانا ہی شان بندگی ہے اس مالک ومولیٰ تبارک وتعالی کی بارگاہ میں اپنی نیازمندی اور اپنی قربانی پیش کرنا ہی سرمایۂ عبودیت ہے۔ عبد و معبود کا رشتہ وعلاقہ وہ ہے کہ جان ومال، عزت وآبرو ہر چیز قربان کی جاسکتی ہے۔ معبود حقیقی کی رضا وخوشنودی کے لیے قربانی، بندے کی سرفرازی ہے۔ قربانی کی مقبولت کا یہ عالم ہے کہ بال بال پر نیکی اور خون کے ہر ہر قطرہ پر ثواب ہے۔

(حدیث) عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ قَالَ قَالَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا هَذِهِ الْأَضَاحِيُّ قَالَ سُنَّةُ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ قَالُوا فَمَا لَنَا فِيهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ بِكُلِّ شَعَرَةٍ حَسَنَةٌ قَالُوا فَالصُّوفُ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ بِكُلِّ شَعَرَةٍ مِنَ الصُّوفِ حَسَنَةٌ (رواہ احمد وابن ماجۃ)

ترجمہ: زید بن ارقم رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ قربانیاں کیا ہیں؟ حضور نے فرمایا: تمھارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے، عرض کیا اس میں ہمارا کیا فائدہ ہے؟ فرمایا ہر بال کے بدلے نیکی ہے۔ عرض کیا اُون میں کیا ہے؟ فرمایا اون میں بھی ہر بال کے بدلے نیکی ہے۔ (مشکاۃ شریف)

اللہ اکبر! قربانی کی مقبولیت بارگاہ الٰہی میں کس بلند مرتبہ پر ہے کہ ہر بال پر نیکی ہے۔ بکری کے جسم پر جتنے بال ہیں اسی کو شمار میں لانا مشکل ہے۔ چہ جائے کہ بھیڑ کی اون کا شمار۔ یوں تو ہر عمل باعث اجر وثواب ہے تمام اعمال صالحہ پر اجر وثواب

کا وعدہ ہے، مگر قربانی میں اجر وثواب کی نرالی ہی شان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قربانی اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک پیاری ادا ہے ان کے رب کو بھا گئی اور پسند آگئی ہے۔ مِنیٰ کی وادی میں رب جلیل کی رضا جوئی کے لیے حضرت خلیل علیہ السلام کا لختِ جگر، نورِ نظر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا۔ یہ وہ ادا ہے کہ زمین وآسمان کی وسعتیں، اس کی رفعت وعظمت سے تنگ ہیں، اور مخلوقات کی زبانیں اس کی تعریف وتوصیف سے قاصر ہیں۔ اللہ اکبر! کتنی تمناؤں اور آرزوؤں کے بعد بڑھاپے میں یہ فرزند عطا ہوئے ہیں جو بلاشبہہ اپنی جان سے بدرجہا زیادہ عزیز ہیں، کائنات کی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں مگر واہ رے حضرت خلیل، قربان آپ کی اس ادا کے کہ اپنے رب کا حکم پاتے ہی اس کی رضا وخوشنودی کے لیے اس فرزند دلبند کو قربان کر دیا، خُلّت اسے کہتے ہیں۔ خلیل ایسے ہوتے ہیں خدائے تعالیٰ سے دوستی اسی کا نام ہے۔ حکم الٰہی پہنچا کہ اپنے فرزند اسماعیل کو ہماری راہ میں قربان کرو۔ فوراً بلا پس وپیش بغیر تامل اپنے ہاتھ سے اپنے نور نظر لخت جگر کو قربان کر دیا۔ حضرت ابراہیم نے تو اپنے فرزند اسماعیل علیہ السلام ہی کو ذبح کیا تھا، انھیں قربان کیا تھا؛ یہ تو رب جلیل کا کرم ہے، اس کا احسان ہے کہ بجائے حضرت اسماعیل کے دنبہ ذبح ہوا۔

اس تبدیلی میں یہ بھی حکمت تھی کہ سنت ابراہیم تا قیامت جاری رکھنا ہے اس لیے سہل فرما دی کہ ہر فرماں بردار بآسانی بارگاہ الٰہی میں قربانی پیش کر سکے۔

فرزند کو ذبح کرنا تو حضرت خلیل کا جذبۂ عبودیت تھا، ہر شخص کا یہ حوصلہ کہاں، حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کے بجائے دنبہ ذبح کرا دیا تاکہ حضرت خلیل کی سنت قیامت تک جاری رہے اور مسلمان تا قیامت اپنے رب کی بارگاہ میں اپنی اپنی قربانیاں پیش کر کے اجر وثواب کے ذخیرے جمع کرتے رہیں۔ اسی لیے حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

سنة أبيكم إبراهيم. یہ قربانی تمھارے باپ حضرت ابراہم علیہ السلام کی

سنت ہے۔ سنت ابراہیمی ہی ہونے کی حیثیت سے قربانی کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ بال بال پر نیکی ہے اور اس کے خون کے ہر ہر قطرہ پر ثواب ہے۔

بڑے خوش نصیب ہیں وہ مسلمان جو اپنے جذبۂ عقیدت اور جوش محبت میں اس سنت کریمہ پر عمل کر کے بارگاہ الٰہی میں قربانی پیش کرتے ہیں، مولائے کریم توفیق، رفیق بخشے۔ آمین۔　　(حافظ ملت قدس سرہ)

(۲) اسلام میں عورت کی شخصیت

جب تک دنیا قرآن کی تعلیم سے نا آشنا تھی اس وقت تک اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ عورت کی کوئی حیثیت یا اس کا کوئی شمار اور زندگی میں کوئی حصہ ہے۔ قرآن آیا تو عورتوں کی حیثیت متعین ہوئی، ان کے حقوق مقرر ہوئے اور معاشرت میں ان کی اہمیت تسلیم کی گئی۔ عیسائیت کی پوری مذہبی تعلیم میں نہ تو عورت کا کوئی حق نظر آتا ہے نہ کوئی حصہ۔ یہودی تعلیمات میں بھی عورت کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایران کے قدیم مذاہب میں بھی عورت کے لیے معاشرے میں کوئی عزت اور سر بلندی کا مقام نہیں۔ شاشتروں اور ویدوں کی تعلیمات میں بھی عورت کی نہ تو کوئی مستقل شخصیت تھی نہ مذہبی حیثیت۔ آج بھی عورت سماج کا ذلیل ترین حصہ اور نا قابل توجہ عنصر ہے۔ اور مختصر یہ کہ عورت پوری دنیا کی مذہبی تعلیم میں کسی حیثیت سے بھی لائق شمار نہ تھی۔ قرآن آیا تو پوری کائنات میں ایک ایک کے حقوق لے کر آیا ہر ایک کی سماجی حیثیت متعین کی، تاکہ خدا کی اس بستی میں کوئی بغیر حیثیت کے نہ رہے۔ قران نے معاشرے کے ہر گوشے میں عورت کو شریک اور حصہ دار بنایا۔

آج کی ترقی یافتہ اور جدید تہذیب و تمدن کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے عورت کو زندگی کے تمام حقوق عطا کیے ہیں اور حیات کے ہر شعبے میں اسے برابر کا حصہ دار بنایا، لیکن جدید دنیا کے تمام دعوے ایک مہمل فریب، ایک حسین جھوٹ کے سوا کچھ بھی نہیں، قرآن نے تو زندگی کے خارجی اور داخلی امور میں عورت اور مرد کے حقوق متعین کر دیے ہیں اور تاکید کر دی کہ خبردار کوئی بھی اپنے حق کی حد سے آگے نہ بڑھنے پائے

جب کہ نئی تہذیب نے تمام حدود کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا قرآن نے مرد کو تمام خارجی امور کا ذمہ دار بنایا اور عورتوں کو گھر کے پورے ماحول کی نگرانی سپرد کی اور جب تک سماج کا یہ ڈھانچہ برقرار رہا معاشرہ صالح پاکیزہ اور اخلاق سے معمور رہا اور جب یہ حد بندیاں توڑ دی گئیں تو پورا معاشرہ انسانیت کے جسم کا ایسا ناسور بن گیا جس کا علاج آج خود تہذیب کے علم برداروں کے پاس نہیں ہے، پھر سوال یہ ہے کہ جدید تہذیب نے عورت کو آزادی کے نام پر کیا دیا؟ اسے گھر سے نکالا، بازاروں، دکانوں اور آفسوں میں پہنچا دیا۔ مطلب یہ کہ ایک عورت دن بھر مرد بن کر آفسوں، کارخانوں اور دوکانوں میں روزی کمانے کا مشقت ترین کام بھی کرے اور شام کو عورت بن کر مرد کی دلچسپی کا سامان بھی پیدا کرے اور اس طرح آزادی کے نام پر اس کمزور صنف کے کندھوں پر سماج کا دوہرا بوجھ ڈال دیا گیا اگر اسی کا نام آزادی ہے تو پھر پابندی کس کا نام ہوگا؟ جب کہ قرآن نے اس صنف لطیف کی نزاکتوں کا پورا خیال رکھا اور اتنا ہی بوجھ ڈالا جتنا وہ برداشت کر سکے، آج کی تہذیب نے دنیا کو ایک شاداب چراگاہ سمجھ کر عورت کو ہر طرح چرنے کی چھوٹ دے دی جب کہ قرآن نے کہا کہ دنیا کوئی چراگاہ نہیں کہ جس کا جہاں جی چاہے منہ مارتا پھرے بلکہ مرد و عورت پر پابندی عائد کر دی کہ اپنی اپنی پسند کے مطابق کسی ایک کا انتخاب کرلو اور تقویٰ و طہارت اور پاکیزگی کی زندگی بسر کرو۔ قرآن حکیم نے عورت کو بیوی کی حیثیت میں اور مرد کو شوہر کی حیثیت میں پیش کیا تو بتایا کہ مرد عورت کے لیے لباس ہے اور عورت مرد کے لیے لباس ہے۔ یعنی شوہر بیوی کے لیے ستر پوش ہے اور بیوی شوہر کے لیے ستر پوش، یہ لباس جہاں ستر پوشی کے کام آتا ہے وہیں جمال و آرائش کا بھی ذریعہ ہے۔ مطلب یہ کہ شوہر بیوی کا سہاگ اور بیوی شوہر کے لیے جمال حیات۔

اور قرآن نے عورت کو ماں کے روپ میں پیش کیا تو فرمایا کہ ماں اور باپ کو نہ تم اُف کہہ سکتے ہو نہ انھیں جھڑکیاں دے سکتے ہو، ہر مرد کسی کا بیٹا ہے، اس لیے اس پر لازم ہوگیا کہ وہ اس عورت کو جو اس کی ماں ہے ایک لفظ بھی تکلیف دہ نہ بولے... حضور صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ماں کے پاؤں تلے جنت ہے، حضور کی خدمت میں ایک صحابی پہنچے اور دریافت کیا یا رسول اللہ! میں کس کی خدمت کروں؟ فرمایا ماں کی۔ دریافت کیا پھر کس کی؟ فرمایا: ماں کی۔ عرض کیا پھر کس کی؟ فرمایا: ماں کی۔ عرض کیا: پھر کس کی؟ تو فرمایا باپ کی۔ مطلب یہ ہوا کہ اولاد پر باپ کے حقوق کے اعتبار سے ماں کا تین گنا درجہ اور حق ہے۔ قرآن کی نگاہ میں عورت کو بیوی، بیٹی اور ماں کی حیثیت سے ہمیشہ حصہ ملتا ہے اور کبھی بہن، بھتیجی، دادی اور نانی کی حیثیت سے حصہ ملتا ہے۔ اور یہ حصہ قطعی اور متعین ہے۔ اس طرح سماج میں عورت ایک مستقل فرد کی حیثیت سے ہے۔ قرآن مرنے والے کی جائداد میں اسے بھی حصہ دلاتا ہے اور کوئی شخص بھی جائداد میں اس کا حصہ خود نہیں لے سکتا۔ ہاں! جائداد کی تقسیم کے بعد عورت اپنے حصے پر قابض ہو جائے پھر کسی کو ہبہ کر دے تو اس کا اسے اختیار ہے، جیسے دوسرے حصہ داروں کو اختیار ہے۔

قرآنی تعلیمات کی روشنی میں عورت کی مستقل حیثیت کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ کوئی شخص کسی کے ساتھ اسے شادی پر مجبور نہیں کر سکتا جس طرح مرد کی اپنی پسند ہے اسی طرح عورت کو بھی پسند کا حق ہے اور کسی کو اختیار نہیں کہ اس کی رضا مندی اور منظوری کے بغیر اس کا نکاح کسی کے ساتھ کر دے۔ جس طرح مرد کی رضا مندی ضروری ہے اسی طرح عورت کی بھی۔

عورت کی عزت اور پاک دامنی پر الزام لگانے کو بدترین جرم قرار دیا گیا ہے۔ اگر الزام غلط ثابت ہو گیا تو ایسا الزام لگانے والے کو اسّی کوڑے مارے جائیں گے اور ساری عمر عدالت میں اس کی گواہی اور شہادت قبول نہ کی جائے گی۔ ان تمام حقوق، اعزاز و عزت کے ساتھ ہی اسلام نے عورتوں کو پابند کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ جب وہ چلیں تو اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ اور اپنی عصمتوں کی حفاظت کریں اور اپنے پاؤں کو زور سے مارتی ہوئی نہ چلیں تا کہ ان کی چھپی ہوئی زینتیں ظاہر نہ ہو جائیں۔ کہیں فرمایا: ایام جاہلیت جیسا بناؤ، سنگار نہ کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم نے عورتوں پر یہ جو پردے کی پابندی عائد کی ہے وہ

عین فطرت کی پابندی کے مطابق ہے۔ جن قوموں نے پردے کو ترک کر دیا ہے ان کی اخلاقی حالت انتہائی پست وخراب ہو چکی ہے۔ حیرت ان پر ہے جنھوں نے عورتوں کو بے پردگی اور آزادروی کی اجازت دے کر بازاروں، سڑکوں اور محفلوں میں بے پردہ گشت کرایا پھر کہیں کوئی ''ناکردنی'' واقع ہوئی ہے تو دوسروں پر برستے اور واویلا مچاتے ہیں۔ آج بے حیائی، بے شرمی اور برائی کی جو گرم بازاری نظر آتی ہے وہ صرف اس لیے کہ نئی تہذیب نے پردے کو ایک بے کار شے سمجھ کر ترک کرنے کی حماقت کی ہے۔

(سہ ماہی الکوثر۔ اپریل تا جون ۱۹۹۸ء، ص ۲۰، ۲۱۔ از مولانا کامل سہسرامی)

(۳) پیغمبر اسلام کا ہمہ گیر انقلاب

رسالت محمدی کا مطالعہ کرتے وقت انسانی فطرت کا یہ تقاضا اگر نظر میں رکھا جائے تو اسلام کی حقانیت کا احساس دوچند ہو جائے گا اور وہ یہ کہ آدمی دل کی رغبت کے ساتھ وہیں قدم رکھتا ہے جہاں کوئی خطرہ نہ ہو یا جہاں آرام اور منفعت کی کوئی امید ہو۔

سب جانتے ہیں کہ مکہ میں آسائش ومنفعت کے سارے وسائل صنادید قریش اور کفار مکہ کے ہاتھوں میں تھے۔ رسول کے قریب آنے والوں کے لیے سوائے قید وبند، سوائے دار ورسن اور سوائے اذیت ونقصان کے مادی آسائش ومنفعت کی کون سی توقع تھی، لوگ دن رات اپنی آنکھوں سے یہ تماشا دیکھتے کہ جس نے بھی رسول کا کلمہ پڑھا، اس کا جینا دوبھر ہو گیا۔ مکہ کی پوری آبادی درپئے آزار ہو گئی اب وہ ستایا جا رہا ہے تو کوئی اس کی حمایت میں کھڑا ہونے والا نہیں۔ خون کے رشتہ داروں سے کچھ توقع تھی تو وہ بھی قاتلوں، سفاکوں اور درندوں کی صف میں ہیں۔

اب عقلائے عالم ہی فیصلہ کریں کہ ان حالات میں فطرت انسانی کا تقاضا کیا ہونا چاہیے۔ کیوں ایسا نہیں ہوا کہ لوگ کلمہ پڑھنے والوں کا حشر دیکھ کر عبرت پکڑتے اور ہرگز ایسے اقدام کا ارادہ نہ کرتے جس کے نتیجے میں ان کی اچھی خاصی زندگی طرح طرح کی اذیتوں میں مبتلا کر دی جائے۔

آخر نبی کی آواز میں وہ کون سی کشش تھی جس نے ان کی فطرت کو ہر طرح کے احساس زیاں سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اور پھر آخر وہ کون سا جذبہ شوق تھا جس نے پروانوں کی طرح جل مرنے کی آرزو ان کے سینوں میں پیدا کر دی تھی، اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اظہار عشق کا انجام کیا ہوگا وہ بے محابا اپنے مقتل کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

ٹھیک ہی کہا ہے کہنے والے نے کہ لذت اور آسائش کا مفہوم سب کے حق میں یکساں نہیں ہوتا۔ کوئی پھولوں کی سیج پر راحت محسوس کرتا ہے اور کچھ ایسے بھی وارفتگان محبت ہیں جنھیں کانٹوں کی نوک سے گھائل ہونے میں مزہ ملتا ہے۔

یہی حال مکہ کے ان فیروز بختوں کا تھا جن کے دلوں میں اچانک یقین کی شمع روشن ہوئی اور وہ آن واحد میں بے حجاب جلووں کے تماشائی بن گئے، انھوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ کونین کی ارجمندی نبی کے قدموں میں مچل رہی ہے، والہانہ جذبہ شوق میں اٹھے اور نبی کے قدموں کے نیچے اپنے دل بچھا دیے۔

نبی کے چہرے میں خدائے ذوالجلال کی تجلیوں کا نظارہ کرنے والوں نے جلتی ہوئی چٹانوں پر اخلاص و وفا کا نقش کندہ کر کے دنیا کو بتا دیا کہ اسلام تلواروں کا مذہب نہیں، عشق و وارفتگی کا مذہب ہے۔ اسلام طاقت کا مذہب نہیں، سپردگی کا مذہب ہے۔ اسلام جارحیت کا مذہب نہیں، صبر و ضبط کا مذہب ہے۔ اسلام جبر و اکراہ کا مذہب نہیں، محبت و دل ربائی کا مذہب ہے۔ اسلام زر، زن اور زمین کے رشتوں کا مذہب نہیں نبی کے اخلاق کی کشش، نبی کے چہرہ پر نور کی طلعت زیبا، نبی کے کردار کے تقدس، سیرت کی پاکیزگی اور نبی کے لائے ہوئے دین کی سچائیوں کا مذہب ہے۔

مکہ کی سرزمین پر شہیدان عشق و وفا کے لہو کا ہر قطرہ پکارتا ہے کہ پیغمبر نے تلوار چلا کر نہیں، قرآن سنا کر اسلام پھیلایا ہے۔ اور مکہ کی گلیوں اور بازاروں میں پتھروں کی چوٹ سے گھائل ہونے والے مظلوموں کا ہر زخم آواز دیتا ہے کہ قبول کرنے والوں نے خوف نہیں شوق سے اسلام قبول کیا ہے۔ دل پہلے مومن ہوا اس کے بعد زبان سے کلمہ پڑھا۔ قہر و جبر سے گردن جھکائی جا سکتی ہے، پر دل نہیں جھکائے جا سکتے۔ دل

کے جھکانے کے لیے جلووں کی کشش چاہیے، شخصیت کی دل ربائی چاہیے، اور سیرت کے تقدس کا جمال چاہیے۔ یہ راز تو وارفتگان شوق ہی بتائیں گے کہ حسن ازل کی کس تجلی سے ان کے قلوب گھائل ہوئے، اور آنکھوں کی پتلیوں میں خدائے واحد وقدیر کا کون سا جلوہ انھوں نے دیکھا تھا کہ ایک نگاہ بندہ نواز پر متاع زندگی تک انھوں نے نثار کر دی۔ اور عشق وعقیدت کا نقطۂ عروج تو یہ ہے کہ دم نکل رہا ہے لیکن قدموں میں مچلنے کی آرزو پوری بشاشت کے ساتھ زندہ ہے۔

جو لوگ بدر واُحد کے معرکوں کو سامنے رکھ کر اسلام پر تلوار اٹھانے کا الزام رکھتے ہیں وہ مکہ کے مقتل کا معائنہ کیوں نہیں کرتے، وہ غار ثور میں جھانک کر حق کی مظلومی کا رقت انگیز منظر کیوں نہیں دیکھتے۔ وہ شعب ابی طالب کے قیدیوں کی بے قرار اور سوگوار راتیں کیوں نہیں دیکھتے۔ وہ تاریخ سے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ مکہ میں اسلام کے پھیلنے کے ابتدا کس طرح ہوئی تھی؟ کس کے قہر وجبر سے لوگ اندھیری راتوں اور پہاڑ کی گھاٹیوں میں چھپ چھپ کر اسلام قبول کرتے تھے۔

مکہ کے نہتے اور کمزور مسلمانوں نے کس کے مظالم سے تنگ آکر اپنا پیدائشی وطن چھوڑ دینا گوارا کر لیا لیکن اپنے نبی کو وہ نہیں چھوڑ سکے۔

وہ کیوں نہیں دیکھتے کہ مکہ میں اسلام اس وقت سے پھیل رہا تھا جب بدر واحد کے معرکے کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھے۔ مکہ میں اسلام اس وقت سے پھیل رہا تھا جب تلوار اسلام کے ہاتھ میں نہیں، اسلام کے دشمنوں کے ہاتھوں میں تھی۔

اس لیے تاریخ کی اس سچائی کے سامنے ہر شخص کو سر تسلیم خم کر دینا چاہیے کہ اسلام دنیا میں اس لیے پھیلا کہ اسلام ہی انسان کا فطری مذہب ہے، جس نے بھی اسلام قبول کیا اس نے جبر نہیں اپنی فطرت کا تقاضا پورا کیا۔ مکہ ہی میں نہیں دنیا کے جس خطے میں بھی اسلام کی دعوت پہنچی اس کی پذیرائی کے لیے صرف سلیم فطرت کی ضرورت تھی، بالکل اسی طرح جس طرح ایک پیاسا پانی پر ٹوٹتا ہے۔ اسلام کے چشمہ صافی پر بھی سلیم الفطرت انسانوں کی پیاسی روحیں بے تحاشا ٹوٹ پڑیں، پیاسے کو پانی

لینے کے لیے رشوت نہیں دینی پڑتی، جبر نہیں کرنا پڑتا، پیاسا ہونا ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ جب تک پیاس نہیں بجھے گی وہ پانی کی تلاش میں سرگرداں رہے گا۔

کچھ اسی طرح کا معاملہ اسلام کے ساتھ بھی پیش آیا۔ سعید روحیں صدیوں سے کسی چشمۂ صافی کی تلاش میں تھیں جیسے ہی یہ خبر پھیلی کہ عرب میں رسالت کی سرزمین سے رحمت و نور کا ایک چشمہ پھوٹا ہے، تشنگان شوق معرفت بے ساختہ اپنے گھروں سے نکل پڑے۔ راہ طلب میں دنیا نے بڑی رکاوٹیں کھڑی کیں، لیکن گزرنے والے کانٹوں سے نہیں برچھیوں کی نوک پر قدم رکھ کر گزر گئے۔ آخر ایک دن فیروز بختیوں کی سحر طلوع ہوئی اور جذبہ طلب کے اخلاص نے رسول کونین کی جلوہ گاہ میں انھیں پہنچا دیا۔ صدیوں کی پیاسی روح بادۂ توحید سے اس طرح سیراب ہوئی کہ حوض کوثر ہی پر وہ دوسرے جام کی تمنا کرے گی۔

درود و سلام کی لگاتار بارش ہو اس جان رحمت پر جس کے تلووں کے دھوون سے آب حیات کو حیات جاوداں ملی۔ درود و سلام کے مہکتے ہوئے پھولوں سے معطر رہے خواب گاہ اس زینت کون و مکاں کی جس نے اسلام کا گھر اس خوبی سے بسایا کہ ایک چراغ سے ہزاروں چراغ جلے، ایک قطرہ اتنا پھیلا کہ دریاؤں کو بہا لے گیا۔ ایک ذرہ اتنا بلند ہوا کہ آسمان کی رفعتوں تک پہنچ گیا۔ ایک پھول کی خوشبو اس طرح پھیلی کہ چمن چمن مہک اٹھے۔

عقل حیران ہے کہ اس پیکر زیبا کے کس کس جلوے کا تماشا دیکھے اور اس کے فضل و جمال کے کن کن نگار خانوں کا نظارہ کرے۔ یہاں تو عالم یہ ہے کہ جدھر دیکھیے اسی کے فیض کے چشمے لہرا رہے ہیں۔ جس طرف نظر اٹھائیے ایک ہی تجلی ہزاروں رنگ میں بکھری ہوئی ہے۔ جہاں جائیے پروانوں کا ہجوم، جس صحرا میں قدم رکھیے دیوانوں کا شور۔

عرش پر تازہ چھیڑ چھاڑ فرش پہ طرفہ دھوم دھام
کان جدھر لگائیے تیری ہی داستان ہے

(علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ)

④ قرآن - ایک عظیم دستورِ حیات

قرآن ایک عظیم کتاب ہے ـــــ سب کو اعتراف ہے ـــــ سب مانتے ہیں، تو پھر قرآن کا قاری، قرآن کا عالم، قرآن کا مفسر بڑا ہونا چاہیے ـــــ معاشرے میں سب سے بڑا ـــــ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

قوم کی امامت وہی کرے جو کتاب اللہ کا ان میں سب سے زیادہ قاری ہو[1]

ہاں! نگاہ مصطفیٰ میں وہی بڑا تھا جس کو سب سے زیادہ قرآن یاد تھا ـــــ اسی پر قسمتوں کا فیصلہ کیا جاتا ـــــ اسی پر عہدوں کی تقسیم ہوتی تھی ـــــ انہیں کے ہاتھ میں اقتدار حکومت کی زمام تھی ـــــ انہیں سے مشورے لیے جاتے تھے ـــــ انہیں کو وظیفے دیے جاتے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشیر قرآن کے قاری ہوا کرتے تھے[2] آپ نے گورنروں کو حکم دیا کہ قرآن پڑھنے والوں کو وظیفے دیے جائیں[3] بلکہ آپ نے خود بھی صحابہ کرام میں ان کے مراتب، قراءت قرآن اور جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد پر وظیفے مقرر کیے[4]۔

الغرض قرآن کا قاری، سفید و سیاہ کا مالک ہوتا تھا، جہاں بان و جہاں آرا ہوتا تھا ـــــ وہی مرکز نگاہ تھا ـــــ وہی مرجع آرزو تھا ـــــ مگر اب ہمارے معاشرے میں کیا ہو رہا ہے ـــــ وہ پڑھانے والا سب سے زیادہ معزز و محترم ہے جو نہ قرآن پڑھتا ہے نہ پڑھاتا ہے، باقی سب کچھ پڑھتا اور پڑھاتا ہے ـــــ ساری دولت اس کے لیے ہے ـــــ ساری عزت اس کے لیے ـــــ اقتدار و حکومت کے سارے وسائل اس کے لیے ہیں ـــــ اور جو قرآن پڑھتا یا پڑھاتا ہے ـــــ اس کے لیے خزانوں کے دروازے تنگ ہیں۔

---

[1] جلال الدین سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۷۰۔
[2] محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الاعراف، ج ۲، ص ۶۶۹ رضا اکیڈمی، ممبئی۔
[3] علی متقی علاء الدین ہندی، کنز العمال، ج ۱، ۲۸۰۔
[4] قاضی ابی یعلی، الاحکام السلطانیہ، ص ۲۲۳۔

اللہ اللہ ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے ـــــ عالم میں ہماری ذلت و رسوائی اسی وجہ سے ہے ـــــ ہم قرآن کا نام لے لے کر جیتے ہیں ـــــ مگر جب قرآن پڑھنے والے کی بات آتی ہے تو صدقہ و خیرات اور زکاۃ کی راہ دکھا دی جاتی ہے ـــــ کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے جو کتاب کبھی مسلمانوں میں سب سے زیادہ محبوب تھی اب سب سے مظلوم ہوگئی ـــــ بات کہاں سے کہاں نکل گئی عرض یہ کر رہا تھا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نگاہ کرم میں قرآن پڑھانے والا سب پڑھانے والوں سے افضل ہے ـــــ اس کے درجے بہت بلند ہیں ـــــ اس کا ثواب سب ثوابوں سے زیادہ، اسی لیے فرمایا:

جس نے قرآن پڑھا، پھر اس نے یہ سمجھا کہ اس کا جو ثواب ملا ہے اس سے بڑھ کر کسی کو ثواب ملا تو اس نے یقیناً اس کو معمولی سمجھا جس کو اللہ تعالیٰ نے عظیم کیا ہے۔[1]

بے شک قرآن عظیم ہے، اتنا عظیم کہ قاریِ قرآن کے والدین کے سر پر ایسا تاج رکھا جائے گا جس کی چمک کے آگے آفتاب بھی ماند پڑ جائے گا۔[2]

اور تو اور ارشاد ہو رہا ہے:

القران شافع مشفع.[3]

ترجمہ: قرآن شفاعت کرنے والا ہے، اس کی شفاعت قبول ہوگی۔

قرآن تو شفاعت کرے گا ہی ـــــ حافظ قرآن کی یہ شان ہوگی کہ اپنے خاندان کے ان دس افراد کی شفاعت کر سکے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی۔[4]

اللہ اللہ نوع انسانی پر اللہ کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے اس کو اپنے کلام سے مشرف فرمایا، اوج ثریا تک پہنچایا ـــــ تاریکیوں میں اجالا کیا ـــــ آفتاب دکھایا ـــــ اس احسان عظیم کے بعد بھی اگر کوئی قرآن سے پیٹھ پھیرتا ہے تو وہ بھرے

---

1. ابو حامد بن محمد غزالی، احیاء علوم الدین، مطبوعہ مصر ۱۳۵۸ھ، ج ۱، ص ۲۷۹۔
2. زکی الدین عبد العظیم بن عبد القوی منذری، الترغیب والترہیب، ج ۳، ص ۱۶۶۔
3. ایضا، ج ۳، ص ۱۶۶۔
4. ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمٰن سمرقندی، سنن دارمی، ص ۱۹۔

گھر کو ویران کرتا ہے ـــــ کیا خوب فرمایا:

جس کے سینے میں قرآن کا کوئی حصہ نہیں وہ ویران گھر کے مانند ہے۔[1]

سارے عالم پر نظر ڈالیں ـــــ ویرانی سی ویرانی ہے ـــــ ویران دلوں نے آبادی کی ٹھانی ہے ـــــ وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام! آباد دل ہی عالم کو آباد کر سکتے ہیں ـــــ جس کا دل برباد ہو وہ نہ جہاں گیر ہو سکتا ہے، نہ جہاں بان و جہاں آرا ـــــ اسی لیے فرمایا گیا کہ قرآن پڑھو اور دل کو بیدار کرو، جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

اِقرَءُوا الْقُرآنَ وَحَرِّكُوا بِهِ الْقُلُوبَ.[2]

ترجمہ: قرآن پڑھو اور اس سے دل کو حرکت دو.

انسان کا دل ایک پیالہ ہے چاہے اس میں زہر بھر دیا جائے ـــــ چاہے اس میں آب حیات بھر دیا جائے ـــــ بعض کتابیں زہر ہیں، بعض تریاق ـــــ خادم مصطفیٰ، نباض قرآن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

انسانی قلوب ظروف ہیں، ان کو قرآن سے بھر دو، اور قرآن کے علاوہ کسی چیز سے نہ بھرو۔[3]

قرآن کیا ہے ایک خوان نعمت ہے ـــــ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوع انسان کے لیے بچھایا گیا ہے ـــــ اب جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے ـــــ میزبان بے نیاز ہے، جو کچھ ہے مہمان ہی کے لیے ہے ـــــ اسی لیے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

بے شک یہ قرآن اللہ کا دستر خوان ہے جو اس سے کچھ سیکھنا چاہے تو ضرور سیکھے بلاشبہہ وہ گھر خیر سے بالکل خالی ہے جس میں اللہ کی کتاب کا کوئی حصہ نہ ہو۔ اس کی

---

[1] ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، ج ۲، ص ۱۱۵۔
[2] ابو بکر احمد بن حسین بن علی بیہقی، السنن الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۳۔
[3] حافظ ابو نعیم احمد بن عبداللہ الاصفہانی، حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، مطبوعہ قاہرہ، ج ۱، ص ۱۳۱۔

مثال ایسے ویرانے کی سی ہے جس کا کوئی آباد کرنے والا نہ ہو۔[1]

اور ایک بات بڑی دل لگتی فرمادی۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس میں نوع انسانی کا مجموعی فائدہ ہے، آپ فرماتے ہیں:

زُلْ مَعَ الْقُرْآنِ حَیْثُ زَالَ.[2]

ترجمہ: ادھر ڈھل جا جدھر قرآن ڈھال دے۔

قرآنی اصول دائمی اور ابدی اصول ہیں ــــــ اور ان اصولوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ زمانے کی وسعتیں اس میں سمائی ہوئی ہیں ــــــ جو باتیں صدیوں سے انسانی مشاہدات و تجربات سے معلوم ہوتی ہیں قرآن نے تجربوں کی تاریکیوں سے نکال کر ہمارے سامنے لاکر رکھ دی ہیں ــــــ یہ قرآن حکیم کا اتنا بڑا احسان ہے نوع انسانی جس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔

یہ عظیم دستور حیات، یہ عظیم کتاب جزیرۂ عرب سے نکل کر دنیا میں پھیلتی چلی گئی ــــــ اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے عالم کو اس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

(از: آخری پیغام، مصنفہ: پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد، ایم، اے، پی ایچ ڈی)

⑤ اسلامی مدارس کی اہمیت

آج دنیا میں دو طرح کے نظام تعلیم رائج ہیں ایک وہ جس کا مقصد دین و مذہب کی تعلیم و ترویج ہے۔ دوسرا وہ جو دین و مذہب کی قید اور دین اسلام سے بہت دور ہے۔

لا دینی نظام تعلیم کا واحد مقصد یہ ہے کہ نئی نسل کے دل و دماغ سے دینی و مذہبی اسپرٹ بالکل ختم کر دی جائے اور وہ یہ سمجھ ہی نہ سکیں کہ ہم کیا ہیں؟ ہمارا مقصد وجود کیا ہے؟ اسی مقصد کی تکمیل کے لیے جا بجا نرسری اسکولوں کا قیام عمل میں آرہا ہے جس کا نقد فائدہ یہ دکھایا جاتا ہے کہ بچے ابتدا ہی سے اخلاق و تہذیب کے حامل بن جاتے ہیں۔ اور انگریزی میڈیم تعلیم حاصل کر کے سن رشد کو پہنچتے پہنچتے لائق فائق انگریزی داں اور ماہر

---

[1] ایضاً ص، ۱۳۰۔

[2] حافظ ابو نعیم احمد بن عبد اللہ الاصفہانی۔ حلیۃ الاولیاء ج ۱، ص ۱۳۴۔

علوم وفنون ہو جاتے ہیں، لیکن باخبر حلقوں سے مخفی نہیں کہ ایسی درس گاہوں کا نصب العین یہ ہے کہ بچے ابتدا ہی سے غیر دینی ماحول میں پرورش پائیں، تا کہ ان کے اندر دینی فکر و مزاج پیدا ہی نہ ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد دل فریب فوائد دکھائے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے وہ سب انتظامات کیے جاتے ہیں جو مادی نگاہوں کو مسحور کر سکیں۔

افسوس یہ ہے کہ مسلم اہل ثروت نے بھی ایسی درس گاہوں میں اپنے ننھے بچوں تک کو داخل کرنا شروع کر دیا، جس کا لازمی نتیجہ بہت جلد سامنے آ گیا کہ اہل دنیا کی زبان پر خواہ وہ بچے لائق فائق کہے جا سکتے ہوں مگر مذہب کی نظر میں واجبی فکر و شعور سے یکسر خالی ہیں۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اہل ثروت خود ایسی درس گاہیں قائم کرتے جن میں عصری طرز تعلیم کی بھر پور رعایت کی جاتی، ساتھ ہی طلبہ کو اس اخلاق و تہذیب کا حامل بنایا جاتا جس کا تقاضا مذہب اسلام کرتا ہے۔ ان درس گاہوں میں ابتدا ہی سے قرآن پاک اور دینیات کی تعلیم دی دی جاتی اور عصری علوم بھی پڑھائے جاتے تا کہ ایک طرف وہ بچے مذہبی جذبات و عواطف اور اسلامی اسپرٹ سے سرشار نظر آتے اور دوسری طرف عصری فنون کے ماہر ہو کر ہر عصری ماہر علوم کی آنکھوں میں آنکھیں ملا کر بات کرنے کی ہمت اور اسلام کی حقانیت و برتری ثابت کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے۔

لیکن مادی نفعِ عاجل کی ہوس یہ سب سوچنے اور انتظام کرنے کی مہلت کب دیتی ہے؟ جہاں بھی ہو بچوں کو داخل کرو، دنیاوی قدر و منفعت حاصل ہونی ضروری ہے۔ مذہب کیا آرام و آسائش دے سکتا ہے کہ اس کے دوام و بقا کی فکر کریں؟

یہ ایک عام طرز تصور ہے جو مسلم آبادیوں خصوصاً مال داروں پر عفریت کی طرح چھاتا جا رہا ہے۔ بہت کم اللہ کے نیک بندے ایسے ملتے ہیں جو مال و دولت کی آغوش میں پہنچنے کے بعد بھی اسلام کو جان و مال عزت و وقار اور عیش و آرام سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ رب کریم ان کے امثال زیادہ کرے۔ (آمین)

ایسے افکار و خیالات کے پیش نظر آپ تصور کریں کہ دینی درس گاہوں کا قیام

کتنا اہم مسئلہ ہے۔ اور ان کی بقا و استحکام میں کیسی کیسی دشواریاں حائل ہیں۔ کہیں تو حکومتیں ادارے چلاتی ہیں اور ان کا ہر خرچ برداشت کرتی ہیں۔ ساتھ ہی تعلیم حاصل کرنے والے بھی فیس کی شکل میں بہت سا خرچ ادا کرتے ہیں۔ اور کہیں ایسا ہے کہ کچھ عاقبت بین افراد در در کی بھیک مانگتے اور ہر طرح کی تکالیف و مصائب کا سامنا کرتے ہیں پھر کہیں وہ اپنے مدارس کی رمق باقی رکھنے کا سامان کر پاتے ہیں۔

پہلے دینی مدارس کی کفالت بھی حکومتیں کیا کرتی تھیں اور علمائے دین کو شاہانہ عزو وقار بھی حاصل تھا مگر اب وہ دور نہیں، خود خاک ہند کے مسلمانوں کو اپنی بقا کا انتظام کرنا ہے۔ اور اپنے ملی وجود و تشخص کی تعمیر کے لیے اپنی متاع بے بہا قربان کرنی ہے۔ ورنہ اس منظر کا تصور بھی ہمارے لیے سوہان روح ہے، جب خدانخواستہ اسلامی مدارس یا ان کا اصلی تشخص باقی نہ رہے۔ مولیٰ تعالیٰ ہمیں دنیاوی برکتوں کے ساتھ دین کی عزت و وقات کے تحفظ اور اس کے فروغ و استحکام کی بھی فکر عطا فرمائے اور صحیح سمت میں چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ (ماہنامہ اشرفیہ، مئی ۱۹۸۷ء۔ ۱۱، ۱۲۔ مولانا محمد احمد مصباحی)

(۶) قائد جنگ آزادی علامہ فضل حق خیرآبادی

علامہ فضل حق خیرآبادی (متولد ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء۔ متوفی ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء) فرزند علامہ فضل امام فاروقی خیرآبادی صدر الصدور دلی (متوفی ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۹ء) علوم اسلامیہ میں شاہ عبد القادر محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۵ء) و شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) اور علوم عقلیہ میں اپنے والد ماجد کے شاگرد تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں تکمیل علوم و فنون کے بعد درس و تدریس میں مصروف ہوئے اور ۱۸۱۵ء میں سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔

حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) نبیرۂ حکیم سید برکات احمد ٹونکی (متوفی ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء) نہایت اختصار کے ساتھ آپ کا تعارف اس طرح تحریر کرتے ہیں۔

ولادت ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء فراغت درس (بعمر ۱۳ سال) ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء

ملازمت کمپنی ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء سے کچھ قبل۔ ولادت فرزند گرامی (مولانا عبد الحق) ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۸ء۔ ولادت فرزند (علاء الحق) ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۰ء۔ وفات والد ماجد (مولانا فضل امام خیر آبادی) ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء۔ کمپنی کی ملازمت (سر رشتہ داری عدالت دیوانی دہلی) سے استعفا ۱۲۴۵ھ/ ۱۸۳۱ء کے اواخر میں۔ ملازمت ریاست جھجر میں ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۲ء۔ پھر چند سال الور، سہارن پور اور ٹونکی میں قیام کے بعد ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء سنے ۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۸ء تک ریاست رام پور میں قیام (محکمۂ نظامت اور مرافعۂ عدالتین کے حاکم کی حیثیت سے) ۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۸ء سے ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء کے اوائل تک لکھنؤ میں قیام (کچہری حضور تحصیل کے مہتمم اور صدر الصدور کی حیثیت سے) ۱۲۷۲ھ /۱۸۵۶ء کے ابتدائی مہینوں میں الور تشریف لائے اور رمضان ۱۲۷۳ھ / مئی ۱۸۵۷ء میں سنہ ستاون کی جنگِ آزادی کے آغاز پر دہلی تشریف لے آئے اور پورے ڈیڑھ سال (مئی ۱۸۵۷ء سے دسمبر ۱۸۵۸ء) تک دہلی اور اودھ کے مختلف اضلاع میں مجاہدین حریت کی رفاقت، اعانت اور قیادت فرماتے رہے۔ جنوری ۱۸۵۹ء میں گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ چلا اور جرم ثابت ہونے پر تمام زرعی اور مسکونہ جائداد اور ذخیرہ نوادر کتب خانہ کی ضبطی اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا سنا دی گئی۔ اکتوبر ۱۸۵۹ء میں پورٹ بلیئر (جزائر انڈمان) پہنچا دیے گئے جہاں ۱۲ر صفر ۱۲۷۸ھ/ اگست ۱۹۶۱ء کو ۶۶ سال کی عمر میں وصال ہوا۔ (ص ۲۰، ۲۱۔ فضل حق اور ۱۸۵۷ء مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی، مطبوعہ برکات اکیڈمی کراچی ۱۹۷۵ء)

نواب فیض محمد خاں والی ریاست جھجھر (پنجاب) کی دعوت پر جب آپ ۱۸۳۱ء میں دہلی چھوڑ کر جھجھر جانے لگے تو بہادر شاہ ظفر نے نہایت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اپنا ایک دوشالہ آپ کو اڑھا کر پرنم آنکھوں سے وداع کرتے ہوئے کہا: چوں کہ آپ جانے کو تیار ہیں اس لیے اب اس کے سوا میرے لیے کوئی چارہ نہیں کہ میں بھی اسے منظور کروں مگر اللہ جانتا ہے کہ لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے۔ (یادگار غالب مطبوعہ دہلی)

جھجھر کے بعد ریاست الور وٹونک ورام پور میں ملازمت کے بعد آخر میں آپ لکھنؤ گئے اور وہاں صدر الصدور اور مہتمم "حضور تحصیل" ہوئے۔ دہلی میں بھی آپ عرصہ تک سردار رہے دوسال تک سہارن پور میں بھی کسی عہدہ پر فائز رہے۔ آپ نے کئی معرکتہ الآرا کتابیں لکھیں اور آپ کے کئی ایک شاگرد اپنے دور کے مشاہیر علما وفضلا میں شمار ہوتے ہیں۔

مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی وعلامہ فضل حق خیرآبادی اور مرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی کے درمیان گہری دوستی تھی۔ علامہ ہی کے مشورے اور آپ کے انتخاب پر دیوان غالب عالم وجود میں آیا جو بقول محمد حسین آزاد: "یہی وہ دیوان ہے جو آج عینک کی طرح لوگ آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔ (آب حیات مطبوعہ دہلی) علامہ فضل حق اور مفتی صدرالدین آزردہ کا گھر دہلی کے علما، فضلا، ادبا اور شعرا کا مرکز تھا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء شروع ہوا تو آپ ریاست الور سے دہلی کئی بار گئے۔ بہادر شاہ ظفر سے ملاقاتیں کیں۔ یہ سلسلہ مئی سے جاری رہا۔ پھر ۲۶؍جون یا پہلی جولائی کو جنرل بخت خاں روہیلہ جب بریلی سے چودہ ہزار فوج لے کر دہلی پہنچا تو منشی ذکاء اللہ دہلوی کے بیان کے مطابق:

علامہ نے بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں علما کے سامنے تقریر کی۔ استفتا پیش کیا۔ مفتی صدرالدین آزردہ، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی، سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کیے۔ اس فتوی کے شایع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی۔ (تاریخ عروج انگلشیہ از: ذکاء اللہ مطبوعہ دہلی)

دہلی پر انگیزوں کا قبضہ ہونے کے بعد کسی طرح یہاں سے نکل کر آپ اودھ پہنچے۔ ۱۸۵۹ء میں آپ پر بغاوت کا مقدمہ چلا اور کالا پانی کی سزا ہوئی۔ آپ نے اپنا مقدمہ خود لڑا اور عدالت میں کہا کہ جہاد کا فتوی میرا لکھا ہوا ہے اور میں آج بھی اپنے اس فتوی پر قائم ہوں۔

پروفیسر محمد ایوب قادری (متوفی نومبر ۱۹۸۳ء کراچی) لکھتے ہیں:

''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا، بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ جزیرۂ انڈمان بھیجے گئے۔ اور وہیں ۱۲؍صفر ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء میں انتقال ہوا۔ جزیرۂ انڈمان میں دفن ہوئے۔ (ص ۳۸۳۔ تذکرۂ علمائے ہند۔ مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی)

علامہ فضل حق کے صاحب زادے مولانا عبد الحق خیرآبادی (متولد ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء۔ متوفی ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء) پرنسپل جامعہ عالیہ کلکتہ کے بارے میں ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر لکھتا ہے: یہ ۱۸۵۷ء کے غدار عالم کے بیٹے ہیں جنھیں حکومت نے کالا پانی کی سزا دی اور ان کا کتب خانہ ضبط کر لیا جو کلکتہ کالج میں موجود ہے۔ (۲۰۲۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان، مطبوعہ نئی دہلی ۲۵)

علامہ کے سوانح نگار اور الثورة الہندیہ (باغی ہندوستان) کے مترجم مولانا عبد الشاہد شیروانی علی گڑھی (متوفی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴) لکھتے ہیں:

مولانا عبدالحق خیرآبادی نے وصیت کی تھی کہ جب انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو میری قبر پر آکر اطلاع دے دی جائے چناں چہ سید نجم الحسن رضوی خیرآبادی نے مولانا کے مدفن درگاہ مخدومیہ خیرآباد ضلع سیتاپور اودھ میں ایک جم غفیر کے ساتھ ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو حاضر ہو کر میلاد شریف کے بعد قبر پر فاتحہ خوانی کی۔ (مقدمہ زبدة الحکمۃ۔ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۴۹ء)

علامہ خیرآبادی کا جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) میں ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ (علما و قائدین جنگ آزادی، ص: ۸۔۱۰، از: مولانا یٰسٓ اختر مصباحی)

⑦ شب براءت

سال کے دنوں اور راتوں میں پندرہویں شعبان کی مقدس رات ''شب براءت'' اور پندرہواں دن بڑی برکتوں کا ہے، امت محمدیہ پر اللہ عزوجل کا کرم خاص ہے کہ

اس نے شب براءت جیسی نورانی رات سے سرفراز فرمایا، یہ رات ہر سال آتی اور چلی جاتی ہے لیکن کتنے غافل اور کاہل ایسے ہیں جو اس کی قدر نہیں کرتے اور سو کر پوری رات گزار دیتے ہیں، ہاں بڑے خوش قسمت اور نیک بخت ہیں وہ اللہ کے اطاعت شعار بندے، جو اس رحمت بھری اور نور و نکہت میں ڈوبی ہوئی شب کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے اور اس میں اپنے مولائے کریم کو یاد کرتے ہیں، اس کی مقدس اور رحمت بھری بارگاہ سے برکت و نور کی خیرات مانگتے اور اپنے گناہوں پر پشیمان و شرمندہ ہو کر توبہ و استغفار کرتے ہوئے اسے گزارتے ہیں، مساکین و غربا پر صدقات و خیرات بھی کرتے ہیں، اقربا و احباب کو تحائف سے بھی نوازتے ہیں، اور ساتھ ہی شہر خموشاں میں آرام کرنے والے مرحومین و متعلقین کو بھی نہیں بھولتے ان کے لیے بھی فاتحہ و ایصال ثواب کا اہتمام کرتے ہیں۔ یقیناً زندوں کے ساتھ اس دنیائے فانی سے کوچ کرنے والے ہمارے بھائی بھی ہمارے احسان و کرم اور امداد و نصرت کے مستحق ہیں۔ لہٰذا مبارک راتوں اور مقدس ایام میں ضرور انھیں بھی یاد کرنا چاہیے۔

دعاؤں کی مقبولیت: شب براءت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں دعائیں مقبول ہوتی ہیں، لہٰذا جملہ دینی و دنیاوی مقاصد پر مشتمل دعائیں اس مبارک شب میں مانگنی چاہیے، اسی لیے علما نے اوقات اجابت یعنی مقبولیت دعا کے اوقات میں شب براءت کو بھی شمار فرمایا ہے۔

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: پانچ راتیں ہیں کہ ان میں دعا رد نہیں کی جاتی، رجب کی پہلی رات، شعبان کی پندرہویں رات (شب براءت) جمعہ کی رات، عیدالفطر کی رات، اور بقر عید کی رات (دسویں ذی الحجہ کی شب) (جامع صغیر ص ۲۴۱، حدیث: ۳۹۵۲)

لہٰذا اس مبارک شب میں یہ چاہیے کہ کثرت سے دعائیں مانگیں، خدائے کریم کی بارگاہ میں اپنی اپنی حاجتیں پیش کریں، اپنے گناہوں سے سچی توبہ کریں۔

حلوا اور فاتحہ: شب براءت میں حلوا پکانا نہ تو فرض ہے نہ سنت نہ حرام بلکہ حق بات یہ ہے کہ شب براءت میں تمام کھانوں کی طرح حلوا پکانا بھی ایک مباح اور جائز کام ہے، اور اگر اس نیک نیتی کے ساتھ ہو کہ ایک عمدہ اور لذیذ کھانا فقرا اور مساکین اور اپنے اہل وعیال کو کھلائے تو یہ بھی ثواب کا کام ہے۔ حلوا وغیرہ پر مرحوم مسلمانوں اور اپنے اقربا کی فاتحہ دلانا یعنی انھیں ایصالِ ثواب کرنا بھی ایک مستحسن اور اچھا کام ہے۔ اسے بدعت سے کوئی تعلق نہیں۔

زیارت قبور: قبروں کی زیارت کو جانا سنت ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کی ہے، اور اس کا حکم بھی دیا ہے، اس کے فوائد و برکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا فَإِنَّهَا تُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا وَ تُذَكِّرُ الْاٰخِرَةَ. (سنن ابن ماجه صْ ۱۱۲)

میں نے تم کو زیارتِ قبور سے منع کیا تھا، اب قبروں کی زیارت کرو اس لیے کہ وہ دنیا سے بے رغبت کرتی ہے اور آخرت کی یاد دلاتی ہے۔

آتش بازی: ماہِ شعبان بالخصوص اس کی پندرہویں شب یعنی شب براءت کی اہمیت وفضیلت اہل اسلام کے نزدیک مسلم ہے، مگر افسوس کہ ایک طرف تو بعض افراد اس کی فضیلت ہی کا سرے سے انکار کرتے ہیں، دوسری طرف اس کے ماننے والوں میں ایک بڑی تعداد ان جاہلوں اور بدعملوں کی ہے جو اس معظم اور سراپا خیر و برکت والی رات کو طرح طرح کے کھیل کود اور آتش بازی جیسے شیطانی افعال سے آلودہ کر کے اس کی فضیلت و نورانیت کا کھلا مذاق اڑاتے ہیں، خدائے تعالیٰ ایسے مسلمانوں کو اپنے غلط اعمال کے محاسبے اور اصلاح کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

آتش بازی ایک برا فعل اور فضول خرچی ہے، فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

"وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ○ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ

لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ○ [سورۂ اسراء ۱۷/ ۲۶-۲۷]

"اور فضول نہ اڑا، بے شک اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے"۔

یعنی شیطان نے جس طرح اپنے رب کی نعمتوں کی قدر نہ کی اور ناشکری کا مرتکب ہوا، تم بھی اللہ عزوجل کی نعمتوں کی ناشکری کرکے اس کی بارگاہ سے دور نہ کر دیے جاؤ، ذرا اس پہلو سے بھی غور کرو کہ پٹاخوں کی کریہ اور شدید آواز سے اس مبارک شب میں قرآن کی تلاوت کرنے والوں، خدا کا ذکر کرنے والوں اور نماز پڑھنے والوں کے ذکر و عبادت میں کس درجہ خلل پڑتا ہے کیا کسی مسلمان سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ خود تو ذکر و عبادت سے دور رہے اور اللہ کے جو بندے عبادت میں مشغول ہوں ان کی عبادت میں خلل ڈالے؟ لہٰذا آتش بازی اور پٹاخے بڑے گناہ کے کام ہیں ان سے کوسوں دور رہنا چاہیے اور گھر کے ذمہ داروں کو چاہیے کہ اپنے اپنے گھر کے نوجوانوں اور بچوں کو بھی اس شیطانی اور فضول کام سے سختی کے ساتھ منع کریں اور اس نورانی رات کی قدر کریں ناشکرے اور شیطان کے بھائی نہ بنیں۔

یہ رات رحمتوں برکتوں سے اپنے دامنوں کو بھرنے اور نیکیوں میں اضافے کی رات ہے نہ کہ گناہ کرکے اپنے اعمال نامے سیاہ کرنے کی۔ پھر ہر سال جو سینکڑوں حادثات رونما ہوتے ہیں وہ الگ ایک مصیبت ہے کتنے مکانات جلتے ہیں اور کتنی دکانیں نذر آتش ہوتی ہیں کتنے مالی نقصانات ہوتے ہیں اور کتنے بچے نوجوان جل کر موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں مزید برآں ایک بڑی مصیبت یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ کمایا ہوا مال بھی ناجائز و حرام ہوتا ہے جس کا استعمال کرنا کرانا آخرت کا وبال مول لینا ہے۔ جب کہ مسلمان پر فرض ہے کہ وہ حلال کمائے اور اس کو اپنے بال بچوں کو کھلائے، حرام کھانے سے عبادتیں قبول نہیں ہوتیں اور دعائیں رد کر دی جاتی ہیں اس سے وہ لوگ سبق حاصل کریں جو آتش بازی اور پٹاخوں کی بڑی بڑی دکانیں لگا کر راتوں رات مال دار بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ (مولانا محمد عبدالمبین نعمانی مصباحی)

(۸) حسن اخلاق اور ہمارا معاشرہ

معاشرہ اجتماعی زندگی سے عبارت ہے۔ اجتماعی زندگی گزارنے کے سلسلہ میں ہماری کچھ اخلاقی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ اسلام ایک آفاقی اور ہمہ گیر مذہب ہے۔ وہ اگر ایک طرف انفرادی زندگی کی تعمیر کا طالب ہے تو دوسری طرف اجتماعی زندگی کی صلاح و فلاح کا بھی داعی ہے۔ آج ہمارا معاشرہ سیکڑوں برائیوں میں مبتلا ہے نہ فرد اپنی معاشرتی، اخلاقی اور دینی ذمہ داریوں کو محسوس کررہا ہے اور نہ ملی سطح پر ہماری کار گزاریوں کی رپوٹ اطمینان بخش ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ عام طور پر سماجی، ملی اور دینی مسائل میں احساس مسئولیت کے فقدان کا رونا رویا جاتا ہے۔ ہر فرد ایک دوسرے کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے ایک طبقہ دوسرے طبقے پر طعن و تشنیع کے تیر و نشتر برساتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر خود اسے اپنی کوتاہیوں اور ذمہ داریوں کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ یعنی دوسرے کی آنکھ کا تنکا تو نظر آتا ہے لیکن اپنے دامن کا داغ نظر نہیں آتا حالانکہ " کلکم راعٍ و کلکم مسئول عن رعیتہٖ" (حدیث) تم میں سے ہر فرد ذمہ دار ہے اور تم میں سے ہر ایک کو اپنی ذمہ داریوں کے حوالے سے جواب دہ بھی ہونا ہے۔

بلاشبہہ یہ ارشاد الٰہی ہے کہ "تم بہترین امت ہو ان میں سے جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں کہ تم بھلائیوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو۔ لیکن " لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ " کے مخاطب بھی تو تم ہی ہو یعنی ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم خود نہیں کرتے۔ ہم جس طرح خود اپنی صلاح و فلاح اور تعمیر و ترقی کے خواہاں ہیں اسی طرح معاشرتی صلاح و فلاح اور تعمیر و ترقی کے خواہش مند بھی۔

اگر ہر فرد اپنی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے برائیوں سے اجتناب کرے اور بھلائیوں کو اختیار کرے تو معاشرہ خود بخود صلاح و فلاح کا گہوارہ اور امن و شانتی کا گلشن بن جائے گا اور پھر ہر طرف صداقت شعاری، حق گوئی، صالح فکری، خوش عملی اور عدل پروری کا موسم، ابرِ بہاراں بن کر چھا جائے گا۔ عہد رسالت کا مدنی

معاشرہ تاریخ اسلام میں اس کی ایک عملی اور زندہ جاوید مثال ہے۔

اسلام نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے دو مستقل باب قائم کیے ہیں اس میں کیا شبہہ ہے کہ حقوق اللہ کی ادائیگی بندوں کا اولین اور اہم ترین فریضہ ہے نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ عبادات کی اہمیت و فرضیت پر قرآن و حدیث نے سیکڑوں مقامات پر پرزور تاکیدیں فرمائی ہیں اور تارکین کے لیے عبرتناک عذاب کی وعیدیں بھی سنائی ہیں۔ لیکن معاشرتی معاملات کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے بندگان مولیٰ کی حق تلفی اور دل شکنی کے بعد رضائے مولیٰ کی طلب لا حاصل سی جدوجہد ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں کچھ اخلاقی برائیاں اس طرح سرایت کر گئی ہیں کہ ان کا گناہ و جرم ہونا ہی دلوں سے محو ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مثلاً حسد و کینہ، نفس پرستی، کذب بیانی، ناانصافی، غیبت و چغل خوری اور ریاکاری وغیرہ اس قسم کی برائیوں میں بڑے بڑے سفید پوش بھی مبتلا نظر آتے ہیں۔ ہم شرابیوں کو تو خوب لعن طعن کرتے ہیں مگر خود چغل خوری میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ چوروں کو تو برا کہتے ہیں مگر خود حسد اور ناانصافی سے پرہیز نہیں کرتے خود تو نفس پرستی میں مبتلا نظر آتے ہیں مگر اپنے دینی بھائیوں کا مذاق اڑانے اور ان کی دل شکنی میں مزہ پاتے ہیں۔ یہ انداز پارسائی بھی خوب ہے، برائی کوئی بھی ہو بہر حال برائی ہے، گناہ گناہ ہے کیسا بھی ہو اور کوئی بھی کرے۔ سنتوں کے اہتمام کی تو دہائی دیتے ہیں لیکن بد معاملگی، بد خلقی اور فریب دہی سے باز نہیں آتے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ " بعثت لاتمم مکارم الاخلاق " میں اخلاقی بلندیوں کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔ اور مسلمان کی شان ان الفاظ میں بیان فرمائی "مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں"

اسلام نے حسن اخلاق پر بڑا زور دیا ہے، اسلام نے اس نکتہ فکر کو بھی سامنے رکھا ہے کہ کوئی انسان اگر عبادات میں مصروف عمل ہے لیکن اخلاقیات میں کوتاہی برت رہا ہے تو وہ اپنی ایمانی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اخلاق کی

برتری ہی ایمانی سرفرازی کی بنیاد ہے۔

فرد اور معاشرہ کی تعمیر اور صلاح و فلاح میں خوش خلقی کا بڑا بنیادی کردار ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

- جس شخص کا خلق بہتر ہوگا اس کا ایمان تمام امت سے اعلیٰ ہوگا۔ بلکہ ایک مومن اپنے حسن اخلاق کی خوبیوں سے عابدین و زاہدین کا منصب حاصل کر لیتا ہے۔
- انسان اپنے حسنِ اخلاق کے باعث ایسے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے جو رات بھر ذکر الٰہی میں کھڑے رہنے اور عمر بھر روزہ رکھنے والے کو نصیب ہوتا ہے۔ (ابوداؤد)

ایک بندہ مومن کی عبادت و ریاضت کی معراج رضائے الٰہی ہوتی ہے انسان زندگی بھر عبادت الٰہی میں مصروف ہے لیکن بد خلقی اور بد معاملگی کے سبب اس کو رضائے مولیٰ کا بلند منصب میسر نہیں تو اس کی عبادت کس کام کی؟۔ اس ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنے رکھ کر ذرا آپ خود غور کریں۔

- اللہ تعالیٰ کے بندوں میں اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہوتا ہے جس کے اخلاق پسندیدہ ہیں۔ (طبرانی)

تم میں سے مجھے سب سے زیادہ پیارا اور آخرت میں سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہوگا جو خوش خلق ہے اور تم میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور روز قیامت مجھ سے دور وہ شخص ہوگا جو بد خلق ہے۔

ان ارشادات کی روشنی میں ہمارا بنیادی نقطۂ نظر آپ پر پورے طور سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اسلام تعمیر فرد اور فلاح معاشرہ کے لیے آپ سے کن افکار و معمولات کا متقاضی ہے، اور عبادات و معاملات کے تعلق سے آپ کی ایمانی اور اخلاقی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ یعنی عبادات معاملات دونوں ہی کے تقاضوں کی تکمیل خدا و رسول کی خوشنودی کے لیے ضروری ہے نہ کہ صرف عبادات اور نہ صرف معاملات۔

(ماہنامہ اشرفیہ، مئی ۲۰۰۱ء۔ ص: ۳۰۔۵، مولانا مبارک حسین مصباحی)

(۹) امانت اور خیانت

ہمارے مذہب میں معاملات کو پاکیزہ رکھنے پر بہت زور دیا گیا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے ماننے والے اپنے دل و دماغ، ذہن و فکر اور ظاہر و باطن کو پاک وصاف رکھنے کے ساتھ ہی اپنے معاملات کو بھی پاکیزہ رکھیں، ان میں کسی طرح کی گندگی نہ آنے دیں۔ آپسی لین دین کے معاملات میں جو اخلاقی جوہر، مرکزی حیثیت رکھتا ہے ''دیانت داری اور امانت'' ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ انسان اپنے کاروبار میں ایمان دار ہو اور جس کا جس پر جتنا آتا ہو پوری ایمان داری سے دے دے۔ اسی کو عربی میں ''امانت'' کہتے ہیں۔ اکثر پیغمبروں کی صفت میں یہ لفظ قرآن کریم میں آیا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے قوم عاد کو مخاطب کر کے فرمایا:

''اُبَلِّغُکُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّیۡ وَاَنَا لَکُمۡ نَاصِحٌ اَمِیۡنٌ'' (الاعراف۔ ۶۸)

ترجمہ: ''میں اپنے رب کے پیغامات تمھیں پہنچاتا ہوں، اور میں تمھارا ایسا خیر خواہ ہوں جو امانت دار ہو''

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:

''اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ'' (الشعراء، ۱۰۷)

ترجمہ: میں تمھارے لیے امانت دار رسول ہوں

یعنی اللہ تعالیٰ نے جو پیغام دے کر مجھے بھیجا ہے وہ بلا کم و کاست تم لوگوں تک پہنچانے والا ہوں، اس میں کمی بیشی یا اپنی طرف سے کوئی ملاوٹ نہیں کرتا۔ اس لیے تمھیں میری بات ماننی چاہیے۔

ہمارے آقا رسول اکرم، سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلانِ نبوت سے پہلے اہل مکہ کی طرف سے ''امین'' کا خطاب ملا تھا، کیوں کہ آپ آپسی معاملات، کاروبار اور لین دین میں نہایت دیانت دار تھے، اور جو لوگ جو کچھ آپ کے پاس رکھتے تھے وہ آپ جوں کا توں ان کو واپس کر دیا کرتے تھے۔

ایک شخص کا حق جو دوسرے کے ذمہ واجب ہو اس کے ادا کرنے میں ایمانداری نہ برتنا، خیانت اور بددیانتی ہے، اگر ایک چیز دوسرے کے پاس امانت ہو اور وہ اس میں بے جا تصرف کرتا ہو یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو تو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے، اسی طرح جو کام کسی کے سپرد ہو وہ اس کو دیانت داری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کے زمرے میں شامل ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں سے جیسے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ امانت و دیانت کو اپنائیں اسی طرح وہ انھیں تاکید کرتا ہے کہ وہ اپنے سارے معاملات میں خیانت اور بددیانتی سے دور رہیں۔ کیوں کہ اسلام کی اخلاقی شریعت میں ہر طرح کی خیانت ممنوع ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے۔

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" (الانفال ، ۲۷)

ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ و رسول سے خیانت نہ کرو، اور آپس کی امانتوں میں جان بوجھ کر بددیانتی نہ کرو"

اللہ اور رسول سے خیانت یہ ہے کہ انسان فرائض کو چھوڑ بیٹھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے سرتابی کرے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

اعلموا أن دینَ اللّٰه أمانة فأدُّوا اِلی اللّٰه ما ائتمنکم علیه من فرائضه وحدُودِهٖ (تفسیر مظهری)

ترجمہ: "یعنی خوب سمجھ لو! اللہ کا دین امانت ہے، اس کے فرائض ادا کرو اور حدود کی پابندی کرو جن کا تمھیں امین بنایا گیا ہے"۔

خیانت دل سے بھی ہوتی ہے اور دیگر اعضاے جسمانی سے بھی۔ یہاں تک کہ آنکھ اور بھوں کے اشارے سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ یقین ہو کہ ایک ذات ہے جو چوری چھپے کی ہر حرکت سے ہر وقت باخبر رہتی ہے تو پھر انسان کو کسی قسم کی خیانت کی جرأت ہی نہ ہو، اسلام اسی یقین کو پیدا کر کے مسلمانوں کے ہر عمل کو خیانت

اور بددیانتی سے پاک کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"یَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ" (المومن - ۱۹)

ترجمہ: "وہ آنکھوں کی خیانت اور سینوں کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے"

مسلمانوں پر لازم ہے کہ اللہ و رسول کے پیغام پر عمل پیرا ہوں، اپنے معاملات پاکیزہ اور صاف ستھرے رکھیں، ان کو خیانت، بددیانتی اور بدعنوانی کی نجاست سے آلودہ نہ ہونے دیں۔ مسلمانوں سے اسلام کا یہی مطالبہ ہے۔ معاملات کی یہ پاکیزگی ان کے لیے دنیا و آخرت کی سرخ روئی اور فلاح و بہبود کی ضامن ہوگی۔ (مولانا نفیس احمد مصباحی)

(۱۰) انٹرنیٹ اور اس کے فوائد و نقصانات

انٹرنیٹ ایک ایسا نظام ہے جس کے ذریعے ہم دنیا بھر کے حالات اور بہت ساری معلومات پلک جھپکتے ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اس کی وجہ سے مواصلاتی شعبے میں انقلابی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ اس سے زیادہ تیز رفتار پیغام رسانی کیا ہو سکتی ہے کہ آپ صرف ایک بٹن دبا کر اپنا پیغام دنیا کے کسی بھی گوشے میں بھیج سکتے ہیں۔ اور جوابی پیغام بھی وصول کر سکتے ہیں۔ پیغام رسانی کا یہ طریقۂ کار "ای میل" کہلاتا ہے۔ اور انٹرنیٹ کے اہم فیچر "ویب سائٹس" ہیں۔ جن سے کروڑوں افراد الیکٹرونک صفحات کی شکل میں بلا مبالغہ روزانہ مستفید ہوتے ہیں۔

انٹرنیٹ دراصل لاکھوں کمپیوٹرز کے باہمی رابطے کا نام ہے اور یہ کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں ہے۔ نہ ہی اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ انٹرنیٹ دراصل ایک طریقہ کار ہے۔ جس کو استعمال کر کے کمپیوٹرز کے ذریعے لوگ ایک دوسرے سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ یہ رابطہ ٹیلی فون یا موبائل کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ انٹرنیٹ سے منسلک ہر قسم کے کمپیوٹر ایک دوسرے سے رابطے کے لیے یکساں کمیونیکیشن کا طریقہ اور یکساں کوڈ استعمال کرتے ہیں۔ اسے انٹرنیٹ کی اصطلاح میں پروٹوکول کہتے ہیں۔ جس کا نام TCP/IP ہے جو

Internet Protocol/Transmission Control Protocol

کا مخفف ہے۔ یہ پروٹوکول ٹرانسمیشن کو کنٹرول کرتا ہے۔ اور انٹرنیٹ پر ایک وقت میں معلومات کا ایک چھوٹا سا حصہ ٹرانسمنٹ کرتا ہے اور اس عمل کو ایک سیکنڈ میں لاکھوں بار دہراتا ہے۔ انٹرنیٹ میں استعمال ہونے والی زبان جو انٹرنیٹ سے منسلک تمام کمپیوٹرز بخوبی سمجھ سکتے ہیں وہ HTML کہلاتی ہے یہ Hpyer Text Markup Language کا مخفف ہے۔ اس کے ذریعے انٹرنیٹ سے منسلک کمپیوٹرز اپنی معلومات کا تبادلہ کر سکتے ہیں یا ڈیٹا بیس استعمال کر سکتے ہیں۔

انٹرنیٹ کا استعمال: انٹرنیٹ کے ذریعے آج کل بہت سے ایسے کام کیے جا رہے ہیں، جن کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے ذریعے ہر قسم کی معلومات کسی بھی ملک کے بارے میں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ جس سے ہمیں اس ملک کی ثقافت اور سیاسی وسماجی حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ اب بہت سے صنعتی ادارے بھی اپنی مصنوعات کے اشتہار کے لیے اسے استعمال کرنے لگے ہیں۔ اور بہت سی اشیا انٹرنیٹ پر فروخت کے لیے بھی پیش کی جا رہی ہیں اور آن لائن شاپنگ کا تصور بھی انٹرنیٹ کی بدولت سامنے آیا ہے۔ جس کی بدولت اب گھر بیٹھے ہر قسم کی چیز کریڈٹ کارڈ استعمال کر کے خرید سکتے ہیں اور کچھ اضافی رقم خرچ کرنے پر وہ چیزیں ہمیں گھر پر ہی دست یاب ہو جاتی ہیں۔ جس سے ہمیں بازار جانے اور وہاں سے لانے کی کوفت سے نجات مل جاتی ہے۔

جس طرح سے دنیا میں فاصلاتی نظام تعلیم کو عروج حاصل ہوا تھا اور بے شمار لوگ اس سے مستفید ہوئے تھے۔ بالکل اسی طرح آج کل دنیا کی بہت سی یونیورسٹیاں بھی آن لائن تعلیم دے رہی ہیں، جس کی بدولت علم کے پیاسے اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ غیر ممالک میں پڑھنے کے خواہش مند طلبہ بھی اس کی بدولت وہاں کی یونیورسٹیوں میں داخلے کی درخواست دے کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے افراد جو کسی بھی میدان میں تجربہ رکھتے ہوں مگر ان کے پاس کسی قسم

کی کوئی بھی سرٹیفکیٹ نہ ہو تو وہ بھی انٹرنیٹ پر موجود ویب سائٹس پر آن لائن ٹیسٹ دے کر سرٹیفکیٹ حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اپنے لیے حصول روزگار کو ممکن بنا سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر بہت سی ویب سائٹس ایسی بھی ہیں جن کی بدولت ہر شخص اپنی من پسند نوکری حاصل کر سکتا ہے، اس کے لیے صرف ان ویب سائٹس پر جا کر آن لائن اپلائی کرنا ہوتا ہے اور بعد میں ان کو انٹرویو کے لیے بلا لیا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل تک شاید کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ ہمیں انٹرنیٹ پر اخبارات بھی پڑھنے کو ملیں گے۔ اب دنیا کے بہت سے اخبارات کے آن لائن ایڈیشن بھی شائع ہو رہے ہیں۔۔

انٹرنیٹ اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگ اسے استعمال کر رہے ہیں۔ اور اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کی خاطر مختلف قسم کی ویب سائٹوں کے ذریعے لوگوں کو اپنے عقائد ونظریات کی طرف مائل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ انٹرنیٹ پر باطل فرقے بھی اسلام کی آڑ میں اپنے غلط عقائد کی تبلیغ کر رہے ہیں اور بہت سے لوگوں کو گمراہ کرنے کا باعث بن رہے ہیں، یہ سب اسی انٹرنیٹ کی کارستانی ہے۔ اس سے قبل یہ لوگ چھپ چھپا کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے اور اب اس ذریعے سے کھل کر سامنے آگئے ہیں۔

انٹرنیٹ کا غلط استعمال: بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا استعمال ان کو برا بنا دیتا ہے جیسے کورا کاغذ بذات خود کچھ نہیں ہوتا تو اس پر لکھی گئی تحریر اس کی پہچان بنتی ہے۔ یہی بات ہم موبائل فون کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح کسی چیز کا غلط استعمال اس کو برا بناتا ہے بذات خود وہ چیز بری نہیں ہوتی ہے۔ بالکل یہی بات انٹرنیٹ کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ اس کو کیسے اور کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔

آج ہم کمپیوٹر کے دور سے گزر رہے ہیں تقریبا ہر گھر میں کمپیوٹر ہے جہاں پر نہ صرف بچوں بلکہ بڑوں کا بھی زیادہ تر وقت کمپیوٹر کے ساتھ گزرتا ہے اور والدین کو پتا بھی نہیں ہوتا کہ ان کے بچے کیا کیا چیزیں دیکھ رہے ہیں۔ حال ہی میں کیے جانے والے ایک سروے سے یہ انکشاف ہوا کہ زیادہ تر والدین کو انٹرنیٹ کے استعمال سے بچوں پر پڑنے والے مضر اثرات کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ جو کہ والدین کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ اس سلسلے میں والدین کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی نگرانی کریں اور انھیں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے مثبت استعمال کی جانب راغب کریں۔ بچے امت مسلمہ کا مستقبل ہیں اور آپ کے پاس امانت ہیں۔ لہٰذا والدین مناسب وقت نکالیں اور صحیح وقت پر ان کی درست رہ نمائی کر کے اپنے فریضے سے عہدہ برآ ہوں۔ اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو پھر بچوں کے غلط راہ پر چلنے اور برے کاموں میں ملوث ہونے کے ذمہ دار آپ ہی ہوں گے۔ یہ والدین کی اخلاقی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ خاص طور پر چھوٹے بچوں کو بلا ضرورت انٹرنیٹ استعمال نہ کرنے دیں بلکہ دوسری تعمیری سرگرمیوں میں ان کو مصروف رکھیں۔

اور اب بات کرتے ہیں ان جرائم کی جو انٹرنیٹ کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ اگرچہ جرائم پہلے بھی ہوتے تھے لیکن اب وہ انٹرنیٹ کی بدولت زیادہ منظّم طریقے سے ہو رہے ہیں۔ اور ان جرائم نے پوری دنیا کو متاثر کیا ہے۔ کیونکہ انٹرنیٹ کے ذریعے اب دوسروں کے کریڈٹ کارڈ چرا کر آن لائن شاپنگ کی جاتی ہے۔ بنکوں کو لوٹ لیا جاتا ہے اور لوگوں کی رقمیں بنکوں سے نکال لی جاتی ہیں۔ جس سے ایک نئی اصطلاح سامنے آئی ہے اور وہ ہے ''سائبر کرائم''۔ آج سے چند سال پہلے شاید لوگوں کو اس بات کا اندازہ بھی نہیں رہا ہوگا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ جب جرائم اس شکل میں بھی ہوا کریں گے۔ اور یہ سب انٹرنیٹ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔

(مولانا حبیب اختر مصباحی استاد: جامعہ اشرفیہ مبارک پور)